امام اعظم ابوحنیفہؒ
(المتوفی ۱۵۰ھ)

اور

حافظ ابوبکر ابن ابی شیبہؒ
(المتوفی ۲۳۵ھ)

(حصہ اول)



مؤلف

مولانا مفتی علی معاویہ بہاری

ادارۃ النعمان ، پیپلز کالونی، گوجرانوالہ


بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام اعظم ابو حنیفہ رح (المتوفی ۱۵۰ھ)

اور

حافظ ابوبکر ابن ابی شیبہ رح (المتوفی ۲۳۵ھ)

(حصہ اول)

مؤلف

مولانا مفتی علی معاویہ بہاری

ناشر

شعبہ نشر واشاعت ادارۃ النعمان، پیپلز کالونی، گوجرانوالہ

نام کتاب	امام اعظم ابو حنیفہؒ اور حافظ ابو بکر ابن ابی شیبہؒ
تالیف	مولانا مفتی علی معاویہ بہاری
کمپوزنگ	ماہیر گرافکس
صفحات	128
تاریخ طبع اول	اپریل 2023
قیمت	
تعداد	

ضروری اعلان:

اہل علم حضرات سے درخواست ہے کہ ہم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے کہ زیر کتاب میں کوئی غلطی نہ ہو لیکن پھر بھی اگر کسی قسم کی کوئی غلطی دیکھیں تو ضرور مطلع فرمائیں۔ ہم آپ کے بے حد مشکور ہوں گے تاکہ اگلے ایڈیشن میں تصحیح کی جا سکے۔ شکریہ

احقر

علی معاویہ بہاری

5 رمضان المبارک 1444ھ

بمطابق 27 مارچ 2023ء

فہرست مضامین

عرض مولف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امام کبیر حافظ ابوبکر بن عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ التوفی ۲۳۵ھ تیسری صدی ہجری کے معروف محدث ہیں جن کی روایت کردہ احادیث کا عظیم ذخیرہ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کے نام سے حدیث کی کتابوں میں وقیع حیثیت کا حامل ہے اور اہل علم صدیوں سے اس سے استفادہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔

حافظ ابن ابی شیبہ نے ''مصنف'' میں ایک مستقل باب اس عنوان سے قائم کیا ہے۔

هذا ما خالف به ابو حنيفة الاثر الذى جاء عن رسول الله صلى الله عليه وسلم.

یہ وہ امور ہیں جن میں ابوحنیفہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے خلاف فتویٰ دیا ہے۔

اس عنوان کے تحت ایک سو پچیس مسائل کا ذکر ہے جن میں حافظ ابن ابی شیبہ کے بقول امام ابوحنیفہؒ نے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قول کیا ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ ان مسائل میں امام ابوحنیفہؒ نے جو فتویٰ دیا ہے، اس کی بنیاد بھی قرآن و حدیث پر ہے، البتہ مختلف اور متعارض احادیث و آثار میں انہوں نے اپنے اصول کے مطابق ترجیحات قائم کی ہیں جو ہر مجتہد کا حق اور منصب ہے اور اسے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے تعبیر کرنا درست نہیں ہے۔

چنانچہ حافظ ابن ابی شیبہ کے اس موقف کے جواب میں مختلف بزرگوں نے قلم اٹھایا اور ان اعتراضات کا جواب دیا جن میں (۱) حافظ عبد القادر القرشی الحنفی التوفی ۷۷۵ھ کی تصنیف ''الدرر المنيفة فى الرد على ابن ابى شيبة فى ما اورده على ابى حنيفة'' (۲) فقیہ وقت امام قاسم بن قطلوبغا الحنفی التوفی ۸۷۹ھ (مولف تاج التراجم فی طبقات الحنفیہ) کی کتاب ''الاجوبة المنيفة عن اعتراضات ابن ابى شيبة على

أبی حنیفة" (۳) علامہ محمد زاہد الکوثری المتوفی ۱۳۷۲ھ کی کتاب "النکت الطریفة فی التحدث عن ردود ابن ابی شیبة علی ابی حنیفة" بطور خاص قابل ذکر ہیں اور یہ تینوں کتابیں عربی میں ہیں۔

اردو میں مصنف ابن ابی شیبہ کے اس جز کا ترجمہ ۱۳۳۳ھ میں شائع ہوا تو اس کا جواب حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حکم سے مولانا احمد حسن سنبھلیؒ نے تحریر فرمایا جو "الاجوبة اللطیفة عن بعض ردود ابن ابی شیبة علی ابی حنیفة" کے نام سے شائع ہوا لیکن یہ صرف پہلے دس اعتراضات کا جواب ہے۔ اسی طرح مولانا ابو یوسف محمد شریف نے "تائید الامام باحادیث خیر الانام" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جس میں امام ابن ابی شیبہ کے پہلے ۱۸/اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جبکہ اس امر کی ضرورت باقی رہی کہ حافظ ابن ابی شیبہ کے اعتراضات کا مکمل اور ترتیب وار جواب اردو میں منظر عام پر لایا جائے چنانچہ مولانا حافظ محمد عمار خان ناصر نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور امام ابوحنیفہؒ پر امام ابن ابی شیبہؒ کے اعتراضات کے ترتیب وار جوابات مکمل تحریر کر دیے جو اورامام اعظم ابوحنیفہ اور عمل بالحدیث کے نام سے سن ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئے تھے۔ اب یہ کتاب کافی عرصہ سے نایاب ہے۔ احقر نے بھی کوشش کی ہے کہ ابن ابی شیبہ کے ان اعتراضات کا جواب لکھا جائے ابھی تک پہلے 25 مسائل کا جواب لکھا گیا ہے، میں نے سوچا کہ جتنا کام ہو چکا ہے اسے شائع کر دیا جائے، بقایا کی کوشش جاری رکھی جائے، اس لیے 25 مسائل کو حصہ اول کے نام سے شائع کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

والسلام

علی معاویہ بہاری

5 رمضان المبارک 1444ھ

بمطابق 27 مارچ 2023ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) اہل کتاب کو رجم کرنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے پانچ روایات ذکر کی ہیں۔
ان میں سے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجم یھودیا ویھودیہ.

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۶۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ سلیم نے ایک (شادی شدہ) یہودی اور یہودن کو سنگسار کیا۔

اعتراض:

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن ابی شیبہؒ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان ابا حنیفۃ قال: لیس علیھما رجم (ایضاً)

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ان دونوں پر رجم واجب نہیں ہے۔

جواب:

اس بات پر ساری امت کا اجماع ہے کہ رجم کی سزا صرف اس زانی کے لئے ہے۔ جس میں احصان کی شرط پائی جائے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک محصن وہ شخص ہے جو عاقل، بالغ آزاد اور مسلمان بھی ہو اگر ان صفات میں سے کوئی ایک صفت بھی مفقود ہو جائے تو وہ شخص محصن نہیں ہے لہٰذا اس نے اگر زنا کیا تو رجم نہیں کیا جائے گا۔

(موطا امام محمد ص ۳۰۸ مکتبہ محمودیہ)

امام صاحب کے نزدیک محصن ہونے کے لیے جہاں دیگر صفات کا ہونا ضروری ہے وہاں مسلمان ہونا بھی شرط ہے اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک غیر مسلم یہودی یہودن کو رجم نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ مسلم والی صفت نہیں پائی گئی۔

امام صاحب کے نزدیک محصن ہونے کے لئے جو مسلمان ہونا شرط ہے اس کے دلائل

ملاحظہ فرمائیں:

امام ابو حنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ۱:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اشرك باللّٰہ فلیس بمحصن

(سنن دار قطنی جلد ۳ ص ۶۸ کتاب الحدود)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا جس نے شرک کیا وہ محصن نہیں

دلیل نمبر ۲:

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یحصن المشرك باللّٰہ شیئا

(سنن دار قطنی جلد ۳ ص ۶۷ کتاب الحدود)

اللہ تعالی کے ساتھ شرک کرنے والا محصن نہیں ہوتا ہے۔

دلیل نمبر ۳:

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں ایک یہودی عورت سے نکاح کا ارادہ کیا تو **فسأل النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ذلك فنهاه وقال: انها لا تحصنك**

انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا اور کہا کہ اس (یہودیہ) سے نکاح کرنے سے تو محصن نہ ہوگا۔

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۶ ص ۵۴۸، نصب الرایہ جلد ۵ ص ۳۲۸، سنن دار قطنی جلد ۳ ص ۶۸، کتاب الحدود دار المعرفۃ بیروت، بدائع الصنائع جلد ۵، ص ۴۹۴، مراسیل ابی داؤد ص ۱۱، مکتبۃ الحسن)

دلیل نمبر۴:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ

لیس علی اھل الکتاب حد (مصنف ابن ابی شیبہ جلد۶ ص۵۲۲)

اہل کتاب پر کوئی حد نہیں۔

دلیل نمبر۵:

حافظ ابن ابی شیبہؒ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ

انه کان لا یری مشرکة محصنة (مصنف ابن ابی شیبہ جلد۶ ص۵۴۸)

عبداللہ بن رضی اللہ عنہما مشرک کو محصن نہیں سمجھتے تھے۔

دلیل نمبر۶:

حافظ ابن ابی شیبہؒ امام شعبی (المتوفی ۱۰۴ھ) اور امام ابراہیم نخعی (المتوفی ۹۶ھ) کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ

یتزوج الیھودیة و والنصرانیة ثم یفجر فقالا یجلد ولا یرجم

اگر کسی آزاد آدمی نے یہودیہ یا عیسائی عورت سے نکاح کیا پھر زنا کا ارتکاب کیا تو دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ اس آدمی کو کوڑتے تو لگائے جائیں لیکن اسے رجم نہیں کیا جائے گا۔

ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ محصن ہونے کے لئے مسلمان ہونا شرط ہے۔

معزز قارئین! ان احادیث سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب غیر مسلم کو رجم نہ کیا جائے حدیث کے موافق ہے نہ کہ مخالف۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

ان روایات میں واقع پورا نقل نہیں کیا گیا۔ ہم پہلے آپ کے سامنے پورا واقعہ نقل کرتے ہیں تا کہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے ان کو رجم کیوں کیا تھا۔

رجم کا پورا واقعہ اس طرح ہے:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

ان اليهود جاؤوا الى رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم، فذكروا له ان رجلا منهم وامراة زنيا، فقال لهم رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلّمَ: ما تجدون في التوراة في شان الرجم فقالوا: نفضحهم ويجلدون، قال عبد الله بن سلام: كذبتم ان فيها الرجم، فأتوا بالتوراة فنشروها، فوضع أحدهم يده على آية الرجم، فقرأ ما قبلها وما بعدها، فقال له عبد الله بن سلام: ارفع يدك فرفع يده فإذا فيها آية الرجم، قالوا: صدق يا محمد فيها آية الرجم، فأمر بهما رسول الله صلى الله عليه وسلم فرجما فرأيت الرجل يحنى على المرأة، يقيها الحجارة.

(بخاری جلد۲ص۱۰۱۱، کتاب الحدود، باب احکام اہل الذمۃ، حدیث نمبر۶۸۴۱)

یہودی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پاس آئے اور کہا کہ ان میں سے ایک مرد اور ایک عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ اس کے متعلق توراۃ میں کیا حکم ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہم انہیں رسوا کرتے ہیں اور کوڑے لگاتے ہیں۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے جھوٹ بولا ہے اس میں رجم کا حکم موجود ہے چنانچہ وہ توراۃ لے کر آئے اور اس کو کھولا تو ان میں سے ایک آدمی نے رجم کی آیت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور اس سے پہلے اور بعد کا حصہ پڑھ دیا۔ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنا ہاتھ اٹھاؤ اس نے ہاتھ اٹھایا تو اس میں رجم کی آیت موجود تھی۔ تو انہوں نے کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے سچ کہا اس میں رجم کی آیت موجود ہے پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا اور دونوں کو رجم کیا گیا (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ) میں نے دیکھا کہ مرد عورت کو پتھروں سے بچا رہا تھا۔

یہ واقعہ بخاری کے علاوہ حدیث کی مندرجہ ذیل کتب میں بھی موجود ہے۔

(۱) مسلم جلد۲ص۶۹، ۷۰، باب حد الزنا حدیث نمبر۴۴۳۷، ۴۴۴۰۔ (۲) سنن ابی داؤد جلد۲ص۶۱۱، باب فی رجم الیہودیین حدیث نمبر۴۴۴۶۔ (۳) سنن ابن ماجہ ص۱۸۴،

باب رجم الیہودی حدیث نمبر ۲۵۵۸

ناظرین کرام! اس واقعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو رجم کرنے کا حکم تورات کے مطابق دیا۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجم کیا تو فرمایا اے اللہ میں وہ پہلا شخص ہوں جس نے تیری کتاب میں سے اس حکم کو زندہ کیا جس کو لوگوں نے چھوڑ دیا تھا (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۴۴۴۷)

یعنی یہود اس پر عمل نہیں کرتے تھے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات کے حکم کو نافذ کیا کیونکہ اس وقت تک رجم کے متعلق اسلام میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی تھا کہ جس مسئلہ میں آپ کو کوئی حکم نہ ملا ہوتا تو آپ اس مسئلہ میں پہلی شریعت کے مطابق فیصلہ فرماتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کوئی نیا حکم ارشاد فرما دے۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب رجم کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے کیونکہ ابوداؤد جلد ۱ ص ۶۱۱ حدیث نمبر ۴۴۵۱ میں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو یہ واقعہ پیش آیا۔

•معلوم ہوا کہ یہ واقعہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے کے فوراً بعد کا ہے جبکہ جرم وسزا اور عدالت سے متعلق احکام مدنی زندگی کے نصف آخر میں نازل ہوئے اس وجہ سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدائی مدنی دور میں تورات کے مطابق فیصلہ فرمایا پھر یہ حکم منسوخ کر دیا گیا۔ اور قاعدہ بھی یہی ہے کہ جب تک نئی شریعت سابقہ حکم کو منسوخ نہ کر دے تو اس وقت تک سابقہ حکم پر ہی عمل کرنا پڑتا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ کا مستدل احادیث جو ہم نے اوپر نقل کی ہیں وہ اس واقعہ رجم کے لیے ناسخ ہیں۔

معزز قارئین! اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب حدیث کے موافق ہے۔

(۲) اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنا

حافظ ابن ابی شیبہ نے اس مسئلہ میں پانچ روایتیں نقل کی ہیں۔

ان میں سے سبرہ بن معبد رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ

اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا يُصَلِّيْ فِيْ اَعْطَانِ الْاِبِلِ.

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸، ص ۳۶۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ نے فرمایا کہ اونٹوں کے باڑے میں نماز نہ پڑھی جائے۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد حافظ صاحب امام ابوحنیفہ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان ابا حنيفه قال: لا بأس بذلك (ایضًا)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں (اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنے میں) کوئی حرج نہیں ہے۔

جواب:

امام ابوحنیفہ نے جو جواز کا فتویٰ دیا ہے اس کی وجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث ہے جس میں تمام روئے زمین کو سجدہ گاہ یعنی نماز کی جگہ بتایا گیا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: أعطيت خمسا لم يعطهن احد قبلي: نصرت بالرعب مسيرة شهر، وجعلت لي الارض مسجدا وطهورا، فايما رجل من امتي ادركته الصلاة فليصل، واحلت لي المغانم ولم تحل لاحد قبلي، واعطيت الشفاعة، وكان النبي يبعث الى قومه خاصة وبعثت الى الناس عامة.

(بخاری جلد ۱، ص ۲۰۸، کتاب التیمم حدیث نمبر ۳۳۵، مسلم جلد ۱ ص ۱۹۹، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰۃ حدیث نمبر ۵۲۱، سنن نسائی جلد ۱ ص ۷۳، باب التیمم بالصعید، حدیث نمبر ۴۳۲، مسند احمد، حدیث نمبر ۹۸۸، سنن ابی داؤد جلد ۱ ص ۷۰، باب فی المواضع التی لا یجوز فیہا، حدیث نمبر ۴۸۹)

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں دی گئی (۱) ایک ماہ کی مسافت تک میرا رعب (دشمن پر بیٹھا دیا گیا) (۲) تمام زمین کو میرے لیے سجدہ گاہ بنا دیا گیا اور پاک بنا دیا گیا۔ بس میرا امتی جہاں کہیں بھی نماز کا وقت پالے تو نماز ادا کرے۔ (۳) میرے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا گیا ہے حالانکہ مجھ سے پہلے کسی کے لئے بھی حلال نہ تھے (۴) مجھے شفاعت یعنی شفاعت کبری دی گئی (۵) ہر بنی کو کسی خاص قوم کی طرف بھیجا گیا اور مجھے تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ اس حدیث مبارکہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان عام ہے۔ زمین کے کسی بھی حصہ کو مستثنیٰ نہیں فرمایا حدیث کا عموم بتا رہا ہے کہ تمام زمین کے تمام حصہ میں نماز پڑھنا جائز ہے خواہ اونٹوں کا باڑا ہو یا کوئی اور جگہ تو معلوم ہوا کہ امام صاحب کا مذہب حدیث کے موافق ہے۔ ہاں جن جن جگہوں کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مستثنیٰ قرار دیا ہے ان جگہوں میں سے ایک جگہ اونٹوں کا باڑا بھی ہے لیکن یہ تخصیص ایک خاص علت کی بنا پر ہے اگر علت پائی جائے گی تو ممانعت بھی ہوگی اور امام صاحب بھی اس کے قائل ہیں امام صاحب جواز کے قائل اس صورت میں جب وہ علت نہ پائی جائے جس کی وجہ سے ممانعت آئی ہے

محدثین کرام کی عبارات سے ممانعت کی علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اونٹ بڑا جانور ہے اور اگر کسی وجہ سے اونٹ بدک جائے تو نمازی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا۔ مقصد اونٹوں کے قریب نماز پڑھنے سے روکنا ہے۔ اور اس کی بنسبت بکری کمزور جانور ہے ان کا ڈر نہیں اسی وجہ سے بکری کے باڑے میں نماز پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اور یہی وجہ حدیث پاک میں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

حدیث نمبر ۱:

حافظ ابن ابی شیبہؒ اپنی سندؒ سے عبد اللہ بن مغفل المزنی رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ

قال النبی صلی الله علیه وسلم صلوا فی مرابض ولا تصلوا فی اعطان الابل فانها خلقت من الشیاطین

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱ ص ۴۲۱، باب صلاۃ فی اعطان الابل)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اونٹوں کے باڑے میں نماز پڑھ لو لیکن اونٹوں کے باندھنے کی جگہ نماز نہ پڑھو کیونکہ وہ شیطان سے پیدا کیے گئے ہیں۔

حدیث نمبر ۲:

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

سئل رسول الله صلی الله علیه وسلم عن الصلاة فی مبارك الإبل، فقال: لا تصلوا فی مبارك الإبل، فإنها من الشیاطین، وسئل عن الصلاة فی مرابض الغنم، فقال: صلوا فیها فإنها بركة.

(سنن ابی داؤد، جلد۱، ص۷۰، باب النهی عن الصلوٰة فی مبارك الابل، حدیث: ۴۹۳)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ کے باڑوں میں نماز پڑھنے کے متعلق پوچھا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم اونٹوں کے باڑے میں نماز نہ پڑھو کیونکہ وہ شیطانوں میں سے ہے اور بکریوں کے باڑے میں نماز کے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہاں نماز پڑھو، کیونکہ وہ باعث برکت ہے۔

حدیث نمبر ۳:

مسند احمد میں روایت موجود ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا تصلو فی عطن الابل فانها من الجن خلقت الا ترون عیونها وهبابها

اذا نفرت وصلو فی مراح الغنم فانها ھی اقرب من الرحمۃ.

(مسند احمد حدیث نمبر ۱۴۲۵)

اونٹوں کے باڑے میں نماز نہ پڑھو کیونکہ یہ جنوں سے پیدا کیے گئے ہیں جب یہ بدکتے ہیں تو کیا تم ان کی آنکھیں اور ان کے جوش و ہوشیاری کو نہیں دیکھتے۔ البتہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لو کیونکہ یہ رحمت کے زیادہ قریب ہیں۔

ان روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اونٹوں کے باڑے میں نماز نہ پڑھنے کی جو ممانعت ہے اس کی علت یہ ہے کہ اونٹ شیاطین میں سے پیدا کیے گئے بدکنے کی صورت میں انسانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور بکریوں کے باڑے میں نماز کی اجازت اس لیے دی گئی ہے کہ وہ نقصان پہنچانے والا جانور نہیں جیسا کہ روایات میں ہے کہ وہ تو باعث برکت ہے۔

اور بعض حضرات محدثین کے نزدیک ممانعت کی علت نجاست کا ہونا ہے کہ اونٹ بڑا اور قد آور جانور ہے جس کی وجہ سے نجاست ہر طرف پھیل جاتی ہے جبکہ بکری کے قد کی پستی کی وجہ سے بول و براز زیادہ جگہ کو نجس نہیں کرتا تو بکری کے باڑے میں نجاست سے بچنا ممکن ہے جبکہ اونٹوں کے باڑے میں ممکن نہیں اور نماز کے صحیح ہونے کے شرائط میں سے ایک شرط جگہ کا ہر قسم کی نجامت سے پاک ہونا بھی ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

لہٰذا امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی مسئلہ یہی ہے کہ جہاں علت پائی جائے وہاں نماز پڑھنا جائز نہیں اور جہاں علت نہ پائی جائے یعنی باڑے میں کہیں پاک ہونے کا یقین ہو یا اونٹ سے امن کی حالت ہو یقین کامل ہو کہ اونٹ کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا تو نماز پڑھنی جائز ہے کیونکہ علت کے نہ پائے جانے کی صورت میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کو سامنے کھڑا کر کے نماز پڑھی ہے اور یہی امام صاحب کا مستدل بھی ہے کیونکہ اگر اونٹوں کے قریب نماز پڑھنے کی ممانعت عام ہوتی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اونٹ کے سامنے یا قریب نماز ادا نہ فرماتے۔ دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

دلیل نمبرا:

حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ

رایت ابن عمر یصلی الی بعیره وقال رایت النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم یفعله.

میں نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو اپنے اونٹ کی طرف نماز پڑھتے دیکھا اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا تھا۔

(بخاری جلد ا ص ٦٥، باب الصلوہ فی مواضع الابل حدیث نمبر ۴۳۰، مصنف ابن ابی شیبہ جلد ا ص ۴۳۰، باب یصلی الی بعیرہ ابوداؤد جلد ا ص ۱۰۰، باب الصلوۃ الی الراحلہ حدیث نمبر ٦۹۲)

دلیل نمبر۲:

(۲) حضرت مقدام رھاویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ، حضرت عباد بن صامت رضی اللہ عنہ اور حضرت حارث بن معاویہ بیٹھے تھے تو ابودرداء نے کہا کہ

ایکم حدیث یذکر حدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم حین یصلی الی بعیر من المغنم قال عباده انا قال: فحدث قال: صلی رسول الله صلی الله علیه وسلم الی بعیر من المغنم

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ا ص ۴۲۰، ابن ماجہ، ص ۲۰۴، باب الغلول حدیث نمبر ۲۸۵۰)

تم میں سے کون وہ حدیث سنائے گا جس میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ سلم نے مال غنیمت کے اونٹ کی طرف رخ کرنے نماز پڑھی تھی؟ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا میں سناتا ہوں حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا سناؤ، انہوں نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تھی۔

دلیل نمبر۳:

حضرت عاصم فرماتے ہیں کہ

رایت انسا یصلی وبینه بین القبله بغیر علیه محمل

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ا ص ۴۲۰)

میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ اونٹ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے اور وہ ان کے اور قبلے کے درمیان تھا۔

دلیل نمبر ۴:

حضرت عمرو فرماتے ہیں کہ

كان ابن عمر يصلي إلى البعير اذا كان عليه رحل

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ا ص ۴۲۰)

جب اونٹ پر کجاوہ ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔

دلیل نمبر ۵:

عبیداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ

رأيت القاسم و سالماً يصليان الى بعيرهما

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ا ص ۴۲۰)

میں حضرت قاسم اور حضرت سالم کو اونٹ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے دیکھا۔

ان روایات سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ اونٹ کے سامنے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں خواہ اونٹ باڑے میں ہو یا باہر ممانعت صرف علت وسبب کے پائے جانے کے وقت ہے جیسا کہ گزر چکا ہے اس ساری بحث سے یہ معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب احادیث کے موافق ہے نہ کہ مخالف۔

(۳) مال غنیمت میں گھڑ سوار کا حصہ

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے پانچ روایات نقل کی ہیں جن میں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعل بالفارس ثلاثة اسھم سھما له وسھمین لفرسه. (مصنف ابن ابی شیبہ جلد۸ ص ۳۶۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھڑ سوار کو تین حصے دیے ایک حصہ گھڑ سوار کا اور دو حصے اس کے گھوڑے کے لیے۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن ابی شیبہؒ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہوئے نقل فرماتے ہیں

ان اباحنیفة قال سھم للفرس وسھم لصاحبه (ایضاً)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا گھوڑے کا ایک حصہ اور ایک حصہ اس کے سوار کا ہوگا۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ گھڑ سوار کو دو حصے دیے جائے ایک حصہ سوار کا اور ایک حصہ گھوڑے کا کیونکہ گھوڑا ایک جانور ہے اور میں ایک جانور کو ایک مسلمان پر فضیلت نہیں دے سکتا۔

چنانچہ امام قاضی ابو یوسف الحنفیؒ (المتوفی ۱۸۲ھ) تحریر فرماتے ہیں

وکان الفقیہ المقدم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ یقول للرجل سھم وللفرس سھم وقال لا افضل بھیمة علی رجل مسلم.

(کتاب الخراج لابی یوسف ص۱۹، دار المعرفة بیروت)

فقیہ اعظم امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں۔ آدمی کے لیے ایک حصہ اور گھوڑے کے لیے ایک حصہ ہے اور فرماتے ہیں ایک جانور کو ایک مسلمان آدمی پر فضیلت نہیں دیتا۔

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ پر مخالفت حدیث کا الزام لگانا درست نہیں کیونکہ امام ابوحنیفہ نے جو مسئلہ اختیار کیا ہے وہ احادیث سے ثابت ہے ہم پہلے وہ روایات نقل کرتے ہیں جن کی وجہ سے امام صاحب نے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر۱:

حضرت مجمع بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

شهدنا الحديبية مع رسول الله صلى الله عليه وسلم فقسمت على ثمانية عشر سهما كان الجيش الفا وخمسمائة ، ثلاثمأة فارس فكان للفارس سهمان (مصنف ابن ابی شیبہ جلد۷ ص۶۶۳، جلد۸ ص۵۰۹، حدیث نمبر۳۷۶۹۹)

ہم حدیبیہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال غنیمت کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم فرمایا اور لشکر میں پندرہ سولوگ تھے (جن میں) تین سوگھڑ سوار تھے (تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) نے گھڑ سوار کے لیے دو حصے مقرر کیے۔

دلیل نمبر۲:

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

انه سهم للفارس سهمين وللراجل سهما

(سنن دار قطنی جلد۵، ص۱۸۸، موسسۃ الرسالۃ بیروت، حدیث نمبر۴۱۰۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھڑ سوار کو دو حصے دیے اور پیادہ شخص کو ایک حصہ دیا۔

دلیل نمبر۳:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قسم غنائم بدر: للفارس سهمان للراجل سهم (کتاب الخراج لابی یوسف ص۱۸، مکتبہ دار المعرفۃ بیروت)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے مال غنیمت کو تقسیم فرمایا گھڑ سوار کو دو حصے دیے اور پیادہ کو ایک حصہ۔

دلیل نمبر۴:

مجمع بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

فقسمها رسول الله صلى الله عليه وسلم على ثمانية عشر سهما وكان الجيش الفا وخمسمائة ثلاث ماة فارس فاعطى الفارس سهمين واعطى الراجل سهما (سنن ابی داؤد جلد۲ص ۳۷۵، حدیث نمبر۲۷۳۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کو اٹھارہ حصوں میں تقسیم فرمایا اور لشکر میں پندرہ سو لوگ تھے (جن میں سے) تین سو گھڑ سوار تھے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھڑ سوار کو دو حصے اور پیادہ کو ایک حصے دیے۔

دلیل نمبر۵:

اسحاق بن ہانیؒ حضرت علی المرتضی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں

علی قال: لفارس سهمان (مصنف ابن ابی شیبہ جلد۷ص ۶۶۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا گھڑ سوار کے لیے دو حصے ہیں۔

دلیل نمبر۶:

حضرت حبیب بن شہابؒ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں اور وہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ

انه اسهم للفارس سهمين و اسهم للراجل سهما

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد۷ص ۶۶۳)

انہوں نے گھڑ سوار کے لیے دو حصے اور پیادہ کے لیے ایک حصہ مقرر کیا۔

دلیل نمبر۷:

منذر بن خمیصہ الہمدانیؒ روایت کرتے ہیں کہ

ان عاملاً لعمر بن الخطاب رضى الله عنه قسم فى بعض الشام للفارس سهم و للرجل سهم فرفع ذلك الى عمر رضى الله عنه فسلمه و اجازه

(کتاب الخراج لابی یوسف ص۱۹)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک عامل نے شام کے کسی علاقے مین گھڑ سوار حصہ دیا اور

پیادہ کو ایک حصہ دیا۔ جب یہ (بات) عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کی گئی تو آپؓ نے اسے قبول کیا اور جائز قرار دیا۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ گھڑ سوار کے دو حصے شریعت نے مقرر کئے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل بھی ہے اور یہی امام ابو حنیفہ کا موقف ہے جو عین احادیث کے موافق ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

ان روایات کے متعلق امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اصولی طور پر تو گھڑ سوار کے دو ہی حصے مقرر ہیں (جیسا کہ آپ نے احادیث میں ملاحظہ فرمایا) لیکن امام وقت امیر لشکر کو اختیار حاصل ہے کہ بطور انعام کے کسی کو تین یا زیادہ بھی دے سکتا ہے اس کی شجاعت بہادری یا میدان کارزار میں کوئی کارنامہ سرانجام دینے کی وجہ سے۔

جن روایات میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھڑ سوار کو تین حصے دیے وہ بطور انعام کے تھا کیونکہ اگر تین حصے گھڑ سوار کا حق ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کم کبھی کسی کو نہ دیتے لیکن روایات ابھی آپ ملاحظہ کر آئیں ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے گھڑ سوار کو دو حصے دیے ہیں اور یہی امام و ابو حنیفہ کے موقف کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔

(۴) دشمن کے علاقے میں قرآن پاک لے کر جانا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہؒ نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک ہی روایت نقل کی ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی ان یسافر بالقرآن انی ارض العدو مخافة ان ینالہ العدو (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۶۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے علاقے میں قرآن پاک کے ساتھ سفر کرنے

سے منع فرمایا اس ڈر سے کہ دشمن اس کو حاصل کر لے گا۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن ابی شیبہؒ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں

قال ابو حنيفة لا بأس بذالك. (ایضاً)

امام ابوحنیفہ کا فرمان ہے کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

جواب:

امام ابوحنیفہ محض فقیہ ہی نہیں بلکہ مجتہد بھی ہیں اور مجتہد کی نظر صرف الفاظ نبوت پر نہیں ہوتی بلکہ الفاظ کے ساتھ ساتھ منشاء نبوت پر بھی ہوتی ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کے علاقے میں قرآن پاک لے کر جانے سے جو منع فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دشمن اس کو حاصل کر کے اس کی بے حرمتی کرے گا۔

جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں موجود ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا تسافروا بالقرآن فانی لا امن ان يناله العدو

(مسلم جلد ۲ ص ۱۳۱، حدیث نمبر ۴۸۴۱)

قرآن پاک کے ساتھ سفر نہ کرو کیونکہ مجھے اطمینان نہیں (یعنی خوف ہے) کہ دشمن اس کو حاصل کر لے گا۔

اس حدیث کے تحت شارح مسلم امام نووی الشافعیؒ (المتوفی ٦٧٦ھ) فرماتے ہیں کہ کافروں کے علاقے میں قرآن پاک لے کر جانے سے جو منع کیا گیا ہے اس کی علت اس حدیث پاک میں مذکور ہے اور وہ خوف ہے (یعنی قرآن پاک دشمن حاصل کر کے اس کی بے حرمتی کرے گا اس بات کے خوف کی وجہ سے منع کیا گیا ہے ہاں اگر اس بات کا اطمینان ہو کہ قرآن مجید ایسی جماعت کے پاس ہو جو دشمن پر غالب آ جانے والے ہوں (اس صورت میں قرآن پاک دشمن کے ہاتھ نہیں لگے گا اور بے حرمتی سے محفوظ رہے گا) تو دشمن کے علاقے میں لے جانے پر کوئی کراہت نہیں بلکہ جائز ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ، امام بخاری اور

دیگر حضرات کا مذہب ہے۔(شرح مسلم للنوی جلد۲ص۱۳۱)

شرح مسلم کی عبارت سے معلوم ہوا کے منع صرف اس صورت میں ہے جب بے حرمتی کا خوف ہو اور یہ منشاء نبوت بھی ہے اگر اس حکم کا کوئی خوف نہ ہو تو قرآن پاک کو دشمن کے علاقے میں لے کر جانے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔لہٰذا امام صاحبؒ کا مذہب حدیث کے مخالف نہیں''۔

(۵)اولاد میں سے بعض کو زیادہ عطیہ دینا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہؒ نے نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے تین روایتیں نقل کی ہیں۔

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

اعطانی ابی عطیة فقالت امی عمرہ بنت رواحه لا ارضی حتی تشهد النبی صلی الله علیه وسلم قال فاتی النبی صلی الله علیه وسلم فقال انی اعطیت ابنی من عمرة عطیة فامرتنی ان اشهدك قال: اعطیت كل ولدك مثل هذا؟ قال: لا، قال فاتقوا الله واعدلوا بین اولادكم.

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد۸ص۳۶۶)

میرے والد نے مجھے کچھ عطیہ دیا تو میری والدہ نے کہا کہ اس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنالیا جائے تو (میرے والد) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ میں نے اپنے بیٹے کو کو کچھ عطیہ دیا ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے اپنی ساری اولاد کو اتنا ہی عطیہ دیا ہے تو انہوں نے کہا نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سے ڈرو اور اپنی اولادوں کے درمیان عدل کرو۔

اعتراض:

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد حافظ ابن ابی شیبہؒ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان ابا حنيفة قال: لا بأس به (ایضاً)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں (اولادوں کو کم یا زیادہ عطیہ دینے میں) کوئی حرج نہیں ہے۔

جواب:

یہ مذہب صرف امام ابوحنیفہ کا نہیں بلکہ امام شافعی، امام مالک کا بھی ہے۔

(شرح مسلم للنووی جلد۲ص ۳۷)

یاد رہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی میں عدل کرنا ہی مستحب ہے اور اولادوں کو عطیہ کرنے میں عدل نہ کرنا امام صاحب کے نزدیک مکروہ ہے حرام نہیں ہے۔ یعنی ہبہ درست ہو گا لیکن مکروہ ہوگا۔ امام صاحب کا اس ہبہ کو درست کہنے کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ایسا کرنا ثابت ہے اگر اولاد کو عطیہ دینے میں عدل کرنا فرض ہوتا اور اس کے خلاف کرنا حرام ہوتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کبھی بھی ایسا نہ کرتے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کوئی عقل مند آدمی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ وہ حرام کا ارتکاب کر سکتے ہیں۔ (العیاذ باللہ) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ عمل اس بات کی دلیل ہے کہ ایسا کرنا حرام نہیں ہے اور اگر کسی نے اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو کچھ زیادہ عطیہ دے دیا تو یہ ہبہ درست ہوگا جیسا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ملاحظہ فرمائیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ۱:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے فرماتی ہیں کہ

ان ابابكر الصديق كان تحلها جادّ عشرين وسقا من ماله بالغابة

(موطا امام مالک ص ۶۴۵، حدیث نمبر ۱۳۵۶/ طحاوی جلد۲ص ۲۲۹، حدیث نمبر ۵۷۱۷)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کو کھجور کے درخت ہبہ کیے تھے جن میں سے بیس وسق کھجور نکلتی تھی جو غابہ (ایک جگہ ہے شام کے راستے میں) میں تھے۔

نوٹ:

کسی روایت سے ثابت نہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اتنا ہی مال اپنی دوسری اولادوں کو بھی دیا تھا بلکہ دوسروں کو چھوڑ کر صرف سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو ہی ہبہ کیے تھے۔

دلیل نمبر۲:

حافظ ابن حجر عسقلانی امام طحاوی کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل نقل فرماتے ہیں کہ

انہ نحل ابنہ عاصما دون سائر ولدہ (فتح الباری جلد۵ ص۲۱۵ المکتبہ السّلفیہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (دوسروی اولادں علاوہ (صرف) اپنے بیٹے عاصم کو عطیہ عطا فرمایا

دلیل نمبر۳:

صالح بن ابراہیمؒ بن عبدالرحمٰن عوف فرماتے ہیں کہ

ان عبد الرحمن فضل بنی ام کلثوم ینحل قسمہ بین ولدہ

(طحاوی جلد۲، ص۲۲۹، باب الرجل ینحل بعض دون بعض، مکتبہ رحمانیہ)

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنی اولادوں کے درمیان عطیہ تقسیم کیا اور اپنی بیوی ام کلثوم کی اولادوں کو زیادہ دیا۔

ان روایات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی اولادوں میں کمی بیشی کے ساتھ ہبہ کرے تو یہ جائز ہوگا۔

دلیل نمبر۴:

جمہور امت کا مذہب بھی یہی ہے کہ اولادوں میں سے بعض کو عطیہ زیادہ دینا جائز ہے مگر مکروہ یعنی خلاف مستحب ہے، عدل کرنا مستحب ہے۔ (فرض نہیں ہے)

چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی الشافعی (المتوفی ۸۶۲ھ) فرماتے ہیں:

وذهب الجمهور الی ان التسویة مستحبة فان فضل بعضا صح و کره

(فتح الباری جلد۵ص ۲۱۴)

جمہور امت کا مذہب یہ ہے کہ عدل کرنا مستحب ہے اور اگر (اولادوں میں سے) بعض کو زیادہ دیا تو ہبہ صحیح ہے (لیکن) مکروہ ہے۔

یہی بات قاضی شوکانی (المتوفی ۱۲۵۰ھ) نے بھی اپنی کتاب نیل الاوطار جلد ۱۱، ص ۱۸۳، باب التعدیل بین اولاد فی العطیہ (مکتبہ ابن جوزی) میں فرمائی ہے۔

دلیل نمبر ۵:

حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے عمل پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا انکار نہ کرنا۔

امام طحاوی الحنفی (المتوفی ۳۲۱ھ) ترقیم فرماتے ہیں کہ

فهذا ابو بكر رضي الله عنه قد اعطى عائشةرضي الله عنها دون سائر ولده ورأى ذلك جائزا ورأته هي كذلك ولم ينكره عليها احد من اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم ورضي عنهم وهذا عبد الرحمن بن عوف رضي الله عنه قد فضل بعض اولاده ايضاً فيما اعطاهم على بعض و لم ينكر ذلك عليه منكر فكيف يجوز لاحد ان يحمل فعل فهولاء على خلاف قول النبي صلى الله عليه وسلم ولكن قول النبي صلى الله عليه وسلم عندنا فيما ذكرنا من ذلك انما كان على الاستحباب

(طحاوی جلد ۲ ص ۲۲۹، مکتبه رحمانیه)

یہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں کہ انہوں نے سیدہ عائشہ کو عطیہ دیا باقی اولادوں کو نہیں دیا اور اس کو جائز قرار دیا اور سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی اسی کی طرح خیال فرمایا اور کسی صحابی نے بھی انکار نہیں فرمایا (حالانکہ ان کے بیٹے نواسے صحابی ہیں) اور یہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں کہ انہوں نے اولاد کو عطیات دینے میں بعض کو بعض پر فضیلت دی اور کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا بس کسی اور کے لیے کیسے جائز ہے کہ وہ ان حضرات کے عمل

کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مخالف قرار دیں ہمارے (احناف کے) نزدیک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے استحباب مراد ہے۔

امام طحاوی کی اس تحریر سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں

(اولاً) کسی ایک صحابیؓ کا بھی ان حضرات کے اس عمل پر انکار واعتراض کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان حضرات کا یہ عمل جائز تھا اور اولادوں کے درمیان عدل فرض نہیں ہاں مستحب ضرور ہے۔

(ثانیاً) اور کسی صحابی کا اعتراض نہ کرنا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع۔ ہے کہ اولادوں کے درمیان عطیہ دینے میں عدل کرنا فرض نہیں اور اس کے خلاف کرنا حرام نہیں ہے بلکہ عدل کرنا جائز ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

یاد رکھیں کسی بھی مسئلہ کی وضاحت کے لیے اس مسئلہ کی تمام روایات کو سامنے رکھنا ضروری ہے ایک دو روایت کو دیکھ کر مسئلہ کا حل ممکن ہی نہیں ہے زیر نظر مسئلہ میں ایک روایت کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا گیا کہ اولادوں کو عطیہ کرنے میں عدل کرنا فرض ہے اور اس کے خلاف کرنا حرام جب ہم نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ والی تمام روایات کو دیکھا تو امام ابو حنیفہ کا مذہب ہی درست ثابت ہوا۔ چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ والی روایت کو امام مسلم نے بھی اپنی "**صحیح مسلم کے جلد ۲ ص ۳۷ باب کراھة تفضیل بعض الاولاد فی الھبة**" کے تحت مختلف سندوں سے نقل فرمایا ہے۔ ان روایات میں سے داؤد بن ابی ہند والی روایت جو مسلم جلد۲ ص ۳۷ میں حدیث نمبر ۴۱۸۵ ہے اس کے آخر میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے والد سے فرمایا اور "**فاشھد علی ھذا غیری**" کہ تم اپنے اس عمل پر میرے علاوہ کسی دوسرے کو گواہ بنالو۔

معزز ناظرین غور فرمائیں! حضرت نعمان کے والد جب اپنے اس عمل پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنانے کے لئے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود گواہ بننے سے انکار فرما دیا لیکن دوسرے کو گواہ بنانے کی اجازت مرحمت فرمادی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نعمان بن رضی اللہ عنہ کے والد کا یہ عمل حرام نہ تھا اگر حرام ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی کسی دوسرے کے لیے معصیت یا حرام فعل پر گواہ بننے کی اجازت نہ فرماتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اجازت دینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اولادوں میں سے کسی کو زیادہ عطیہ دینا جائز ہے لیکن خلاف اولیٰ اور مکروہ ہے جس کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس سے اجتناب فرمایا نہ کہ حرام ہونے کی وجہ سے۔

اور صحابی کو عدل کا حکم کرنا بطور استحباب کے تھا نہ کہ بطور فرض کے اور امام ابوحنیفہ بھی اس کے قائل ہیں جیسا کہ بالتفصیل گزر چکا ہے۔

محترم قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل اور جمہور امت کے مذہب کے موافق ہے۔

(٦) مدبر غلام کو بیچنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے دو روایات نقل کی ہیں۔

دبر رجل من الانصار غلام له ولم یکن له مال غیره فباعه النبی صلی الله علیه وسلم فاشتراه النجام عبدًا قبطیًا مات عام الاول فی امارة ابن الزبیر.

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ٨ ص ٣٦٦)

ایک انصاری آدمی نے اپنے غلام کو مدبر بنایا اس انصاری کے پاس اس مدبر کے علاوہ کوئی مال نہیں تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مدبر کو بیچ دیا۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد ابن ابی شیبہ امام صاحبؒ پر اعتراض کرتے ہوئے نقل فرماتے ہیں کہ

ان ابا حنیفة قال: لا یباع (ایضاً)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ مدبر غلام نہیں بیچا جا سکتا۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا مؤقف احادیث کے موافق ہے ہم پہلے ان روایات کا ذکر

کرتے ہیں جن کی بنا پر امام ابوحنیفہؒ نے مدبر کوفروخت کرنے کے ناجائز ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ۱:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

ان النبی صلی الله علیه وسلم قال: المدبر لا یباع ولا یوهب، وهو حر من الثلث. (بیہقی جلد۱۰ص ۵۲۹، مکتبہ دارالکتب العلمیہ بیروت)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مدبر کو نہ بیچا جائے اور نہ ہبہ کیا جائے اور وہ آزاد ہے تہائی مال سے۔

دلیل نمبر ۲:

حضرت نافع حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔

قال ابن عمر لا یباع المدبر (بیہقی جلد۱۰ص ۵۲۸، حدیث نمبر ۲۱۵۷۷)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ مدبر (غلام) کو نہ بیچا جائے۔

دلیل نمبر ۳:

حضرت حسن بصری سے مروی ہے کہ

قال زید بن ثابت رضی الله عنه لا یباع المدبر

(بیہقی جلد۱۰ص ۵۲۹، حدیث نمبر ۲۱۵۷۶)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا مدبر کو نہ بیچا جائے۔

دلیل نمبر ۴:

قاضی شریحؒ فرماتے ہیں:

المدبر لا تباع (مصنف ابن ابی شیبہ جلد۵ص ۷۷ باب فی بیع المدبر)

مدبر کو فروخت نہ کیا جائے۔

دلیل نمبر ۵:

حضرت سعید بن مسیبؒ (المتوفی ۹۴ھ) فرماتے ہیں کہ

المدبرة لا يبيعها سيدها ولا يزوجها ولا يهبها وولدها بمنزلتها.

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۵ ص ۷۷)

مدبرہ باندی کو اس کا آقا نہ بیچ سکتا ہے نہ اس کی شادی کروا سکتا ہے اور نہ ہی اسے ہبہ کر سکتا ہے اور مدبرہ کا بچہ اسی کے حکم میں ہے۔

دلیل نمبر ۶:

امام شعبیؒ فرماتے ہیں:

المعتق عن دبر بمنزلة المملوك الا انه لا يباع ولا يوهب.

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۵ ص ۷۷

مدبر غلام عام غلاموں کی مانند ہے مگر یہ کہ اسے بیچا نہیں جا سکتا ہے اور نہ ہی ہبہ کر سکتے ہیں۔ (یہ فرق ہے)

دلیل نمبر ۷:

حضرت عطاء ابن ابی رباحؒ فرماتے ہیں:

لا يبيعها الا ان يحتاج الى ثمنها (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۵ ص ۷۷)

مدبر کو بیچا نہیں جا سکتا ہاں اگر اس کی قیمت کی ضرورت ہو تو بیچ سکتا ہے۔

دلیل نمبر ۸:

عثمان بن حکیمؒ فرماتے ہیں:

سالت سالما: ايحل لى ان ابيعها؟ قال لا قلت امهرها؟ قال لا

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۵ ص ۷۷

میں نے سالم سے پوچھا کہ کیا میرے لیے (مدبر غلام) بیچنا جائز ہے؟ انہوں نے فرما

نہیں، میں نے سوال کیا کہ کیا میں اس کی شادی کروا سکتا ہوں فرمایا نہیں۔

ان روایات سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ مدبر کو فروخت کرنا جائز نہیں ہے امام صاحب کا مذہب حدیث کے موافق ہے نہ کہ مخالف۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

امام ابو حنیفہ نے ان حدیثوں کی مخالفت نہیں کی ہے کیونکہ امام ابو حنیفہ کا فتوی بھی ان احادیث پر عمل کرنے کا ہی فرق صرف اتنا ہے کہ

ابو حنیفہؒ کے نزدیک مدبر کی دو قسمیں ہیں (۱) مدبر مطلق (۲) مدبر مقید

مدبر مطلق اس غلام کو کہتے ہیں کہ آقا اسے کہے کہ میرے مرنے کے بعد تم آزاد ہو اور اس نے کسی قسم کی قید نہیں لگائی اس لیے یہ مدبر مطلق ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اس میں آزادی کا شائبہ آچکا ہے۔اس لیے اسے بیچنا جائز نہیں ہے آقا کے مرنے کے بعد فوراً آزاد ہو جائے گا اور یہی امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔

دوسرا مدبر مقید اس غلام کو کہتے ہیں کہ آقا اس سے کہے کہ اگر میں اس مرض میں مر جاؤں یا مجھے کوئی حادثہ پیش آ گیا اور میں مر گیا تو تم آزاد ہو تو یہ مدبر مقید ہے کیونکہ اس مرض میں یا کسی حادثہ میں مرنے کی قید (شرط) لگائی ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اگر آقا اس مرض میں یا کسی حادثہ میں مرے گا تو غلام آزاد ہو جائے گا کیونکہ یہ ابھی مکمل غلام ہے اور احناف کے نزدیک مدبر مقید کا بیچنا جائز ہے۔اور امام صاحب کے نزدیک مذکورہ حدیث میں جس غلام کو بیچا گیا تھا وہ مدبر مقید تھا جسے بیچنا امام ابو حنیفہ کے نزدیک بھی جائز ہے چنانچہ اسی حدیث کو امام بیہقی نے اپنی سنن میں ایک اور دوسری سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے

ان رجلاً من الانصار اعتق مملوكه ان حدث به حدث فمات فدعا به النبي صلى الله عليه وسلم فباعه.

(بیہقی جلد ۱۰، ص ۵۲۴، حدیث نمبر ۲۱۵۵۴ مکتبہ دار الکتب العلمیہ بیروت)

ایک انصاری نے اپنا غلام (اس شرط پر) آزاد کر دیا کہ اگر اس (مالک) کو کوئی حادثہ

پیش آیا اور وہ مر گیا (تو وہ آزاد ہے) پس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلام کو بلوایا اور اسے بیچ دیا۔

اس روایت سے بات بالکل واضح ہوگئی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مدبر غلام کو فروخت فرمایا تھا وہ مدبر مقید تھا جس کے ساتھ اس کے آقا نے حادثہ کی قید (شرط) لگائی تھی نہ کہ مطلق اور ایسے مقید مدبر کا بیچنا امام صاحب کے نزدیک بھی جائز ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب اس حدیث کے خلاف نہیں ہے۔

(۷) میت پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے سات روایات نقل کی ہیں جن میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

صلی النبی علیه الصلاة والسلام علی قبر بعد ما دفن

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۶۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر نماز جنازہ پڑھی۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ان النبی صلی الله علیه وسلم صلی علی النجاشی فکبر علیه اربعا.

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی پر نماز جنازہ پڑھی تو چار تکبیریں کہیں۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد ابن ابی شیبہ امام ابوحنیفہ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ان ابا حنیفة قال: لا یصلی علی میت مرتین (ایضاً)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں میت پر دو مرتبہ نماز (جنازہ) نہ پڑھی جائے۔

جواب:

اس اعتراض کے دو جواب ہیں۔

جواب نمبر ا:

امام ابوحنیفہ کا مذہب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے عمل کے موافق ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ا:

ملک العلماء امام علاؤ الدین الکاسانی ؒ الحنفی (المتوفی ۵۸۷ھ) اپنی کتاب بدائع الصنائع میں روایت نقل کرتے ہیں

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی علی جنازۃ، فلما فرغ جاء عمر و معہ قوم فاراد ان یصلی ثانیا، فَقَالَ لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الصلوۃُ عَلَی الْجَنَازَۃَ لَا تُعَادُ ولکن ادع للمیت واستغفر لہ

(بدائع الصنائع جلد ۲ ص ۴۷، باب بیان من یصلی علیہ، دار الکتاب کوئٹہ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) کسی کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور کچھ صحابہ کرام ان کے ساتھ تشریف لائے تو انہوں نے دوبارہ نماز جنازہ پڑھنی چاہی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (نے منع فرمایا) اور کہا کہ میت پر دوبارہ نماز جنازہ نہ پڑھی جائے بلکہ تم میت کے لیے دعا اور استغفار کرو۔

اس روایت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے موافق ہے۔

دلیل نمبر ۲:

ان ابن عباس فاتتہ صلوۃ علی جنازۃ فلما حضر ما زاد علیٰ الاستغفار.

(بدائع الصنائع جلد۲ ص ۴۷)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نماز جنازہ فوت ہوگئی تو انہوں نے صرف استغفار ہی کیا (دوبارہ نماز جنازہ نہ پڑھی)

دلیل نمبر ۳:

حضرت نافعؒ (المتوفی ۱۱۷ھ) فرماتے ہیں کہ

کان ابن عمر اذا انتھیٰ الی جنازۃ وقد صلی علیھا دعا وانصرف ولم یعد الصلاۃ (مصنف عبدالرزاق جلد۳ ص ۳۸۸، حدیث نمبر ۶۶۴۸، مکتبہ دارالتاصید)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جنازہ میں اس وقت پہنچتے جب جنازہ پڑھی جا چکی ہوتی تو (صرف) دعا کرتے اور دوبارہ جنازہ نہ پڑھتے۔

دلیل نمبر ۴:

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

(٤) عن عبد الله بن سلام انه فاتته الصلوة على جنازه عمر رضى الله عنه فلما حضر قال ان سبقتمونى با لصلوة عليه فلا تسبقونى بالدعاء له.

(بدائع الصنائع جلد۲ ص٤٨)

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ فوت ہوگئی تو جب وہ حاضر ہوئے تو فرمایا تم نے نماز جنازہ میں مجھ پر سبقت کی ہے لیکن دعا میں میں مجھ سے سبقت نہ کرو۔

دلیل نمبر ۵:

(۵) حضرت نافع سے ہی مروی ہے کہ

ان ابن عمر قدم بعد ما توفی عاصم اخوہ فسأل عنه فقال این قبرا خی؟ فدلوہ علیه فاتی له فدعا له. (مصنف عبدالرزاق جلد۲ ص ۳۸۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اپنے بھائی عاصم کی وفات (تدفین) کے بعد آئے اور بھائی کے بارے میں پوچھا اور فرمایا کہ میرے بھائی کی قبر کہاں ہے؟ لوگ ان کی قبر پر لے گئے تو انہوں نے (بھائی) کے لیے (صرف) دعا کی۔

دلیل نمبر ۶:

حضرت حسن بصری (المتوفی ۱۱۰ھ) کے متعلق امام عبدا رزاق (المتوفی ۲۱۱ھ) نقل فرماتے ہیں کہ

عن الحسن کان اذا فاتته الصلوٰۃ لم یصل علیھا

جب ان سے نماز جنازہ فوت ہو جاتی تو وہ (دوبارہ) میت پر جنازہ نہیں پڑھتے تھے۔

دلیل نمبر ۷:

حضرت ابراہیم النخعی (المتوفی ۹۶ھ) فرماتے ہیں کہ

لا یعاد علی میت الصلوٰۃ (مصنف عبدالرزاق جلد۳ص ۳۸۸)

میت پر دوبارہ نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔

ان روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ میت پر دوبارہ نماز جنازہ نہ پڑھی جائے۔

جواب نمبر ۲:

میت پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا یہ کوئی سنت عمل نہیں اور نہ امت کے لئے عام اور ضروری حکم ہے اگر چہ بعض جنازے کے متعلق روایات میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دفن کے بعد دوبارہ نماز جنازہ پڑھی ہے تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے۔ اگر امت کے لئے قابل عمل ہوتا تو اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس پر عمل کرتے لیکن صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل نہیں کیا جیسا کہ گزر چکا ہے بلکہ تاخیر سے پہنچنے کی صورت میں میت کے حق میں صرف دعا اور استغفار ہی کرتے تھے۔

اور امام علاء الدین الکاسانیؒ فرماتے ہیں کہ نماز جنازہ فرض کفایہ ہے (جو بعض افراد کے ادا کر لینے سے ادا ہو جاتا ہے) لہٰذا ایک مرتبہ ادا کر لینے سے فرض ادا ہو گیا (سب کی طرف سے) اسی وجہ سے اگر کوئی دوسری مرتبہ بھی نماز ترک کر دے تو گناہ نہیں ہوتا کیونکہ فرض ساقط ہو چکا ہے۔ جب فرض کفایہ ہونے کی وجہ سے فرض ساقط ہو گیا تو اب اگر دوسری مرتبہ نماز پڑھے تو وہ نفل نماز ہوگی اور نفل نماز جنازہ پڑھنے کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں۔

(بدائع الصنائع جلد۲ص ۴۸)

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

حافظ ابن ابی شیبہؒ نے نجاشی کی نماز جنازہ کے واقعے کو میت پر دوبارہ نماز پڑھنے کے مسئلہ میں بطور دلیل کے پیش کیا ہے حالانکہ اس واقعہ میں اس بات کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے کہ نجاشی کی نماز جنازہ حبشہ میں پہلی مرتبہ پڑھی گئی ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری مرتبہ پڑھی ہو۔ بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ نجاشی کی نماز جنازہ حبشہ میں پڑھی ہی نہیں گئی تھی۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری جلد۳ ص ۱۸۸ میں فرمایا ہے۔ لہٰذا اس روایت کو امام صاحب کے خلاف دوسری نماز جنازہ پڑھنے کے جواز پر بطور دلیل کے پیش کرنا درست ہی نہیں کیونکہ نجاشی کی ایک ہی مرتبہ نماز جناز پڑھی گئی تھی۔ ہاں اس روایت کا تعلق غائبانہ نماز جنازہ سے ضرور ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ حالانکہ یہ بھی درست نہیں۔ کیونکہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی اور معجزانہ طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نجاشی کی وفات کی خبر دی گئی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مدینہ اور حبشہ کے درمیان حجاب اٹھا دیے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا جنازہ سامنے رکھا نظر آ رہا تھا۔ (فتح الباری جلد۳ ص ۱۸۸)

معلوم ہوا کے حقیقت میں یہ جنازہ غائبانہ تھا ہی نہیں کیونکہ میت معجزانہ طور پر حضور صلی اللہ وسلم کے سامنے کر دی گئی تھی۔ اور رہی وہ روایات جن میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تدفین کے بعد نماز جنازہ دوبارہ پڑھی جس کو حافظ صاحبؒ نے دوبارہ جنازہ پڑھنے کے بارے میں بطور دلیل کے پیش کیا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ:

یاد رکھیں یہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات میں سے ہے اور اس خصوصیت اور علت کا خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سیاہ فام عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی یا ایک نوجوان تھا۔ ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہ پایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرد یا عورت کے متعلق پوچھا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا وہ فوت ہو گیا ہے۔ حضور اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم لوگوں نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی یعنی اطلاع دینی چاہیے تھی پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے قبر پر لے چلو تو صحابہ کرامؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی قبر پر لے گئے تو وہاں قبر پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ پڑھی پھر فرمایا

ان ھذہ القبور مملوءۃ ظلمۃ علی اھلھا و ان اللہ عز و جل ینورھا لھم بصلاتی علیھم

(صحیح مسلم جلد۱ص ۳۰۹، فصل فی الصلوٰۃ علی القبر حدیث نمبر ۲۲۱۵، مصنف عبدالرزاق جلد۳ص ۳۸۷، مکتبہ دار التاصید)

قبر والوں کے لئے یہ قبریں اندھیرے سے بھری ہوئی ہیں اور میری ان پر نماز پڑھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے لیے ان قبروں کو منور فرما دیتا ہے (نور سے بھر دیتا ہے)

اس روایت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دفن کے بعد جنازہ پڑھنے کی وجہ واضح ہو جاتی ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے قبر والے کو راحت ہوتی ہے اللہ قبر کو منور فرما دیتا ہے تو یہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی خصوصیت ہے اس خصوصیت کی وجہ سے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز جنازہ سے رہ جاتے تو دفن کے بھی بعد نماز جنازہ پڑھتے۔

دوسری وجہ:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ علم کا تدفین کے بعد دوبارہ جنازہ پڑھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے ملا علی قاری الحنفی (المتوفی ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں:

والا قرب ان یحمل علی الاختصاص ثم رأیت السیوطی ذکر فی النموذج اللبیب" انہ ذکر بعض الحنفیۃ انہ فی عھدۃ لا یسقط فرض الجنازۃ الا بصلاتہ. (حاشیہ بخاری جلد۱ص ۱۶۷، مکتبہ المیزان)

(رسول اکرم اکرم صلی اللہ علیہ کا تدفین کے بعد جنازہ پڑھنا) یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات پر محمول ہے (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی) پھر میں نے امام سیوطی کی کتاب ''النموذج اللبیب'' دیکھی۔ جس میں انہوں نے فرمایا کہ بعض حنفیہ نے ذکر

کیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تک نماز جنازہ ادا نہ فرماتے جنازہ کا فرض (کفایہ) ساقط نہ ہوتا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس جنازہ سے رہ جاتے تھے تو تدفین کے بعد بھی اس لیے ادا فرماتے تھے کہ نماز جنازہ فرض کفایہ ہے کسی ایک فرد کے ادا کرنے سے سب کے ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم جنازہ ادا نہ فرماتے فرض ساقط نہ ہوتا تھا۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ جنازہ ادا فرماتے کہ فرض ساقط ہو جائے۔

قارئین کرام! اس مکمل تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک حدیث کے خلاف نہیں ہے۔

(۸) ہدی کے جانور کو زخم لگانا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہؒ نے تین روایات نقل کی ہیں جن میں سے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ

ان النبی صلی الله علیه وسلم اشعر فی الایمن وسلت الدم بیده

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۶۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہدی کے) داہنی طرف زخم لگایا اور اپنے ہاتھ سے خون پونچھا۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد ابن ابی شیبہؒ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہی ہوئے فرماتے ہیں کہ

ان ابا حنیفة قال: الاشعار مثلة (ایضاً)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ شعار کرنا مثلہ ہے۔

جواب:

امام ابوحنیفہ پر مخالفت حدیث کا الزام درست نہیں ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ تو وہ شخص

ہے جو صحابہ کے قول کے مقابلے میں بھی اپنی رائے کو ترک فرما دیا کرتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر مکی الشافعی (المتوفی ۹۷۴ھ) امام صاحب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

ان کان فی المسلة حدیث صحیح تبعه وان کان عن الصحابة والتابعین فکذالك والا قاس فاحسن القیاس.

(الخیرات الحسان ص ۲۷ بحوالہ مقام ابی حنیفہ ۱۸۳)

اگر کسی مسئلہ میں صحیح حدیث ہوتی تو آپ اس کی اتباع کرتے اور اگر صحابہ اور تابعین سے اس کا حکم ملتا تو اس کی پیروی کرتے ورنہ قیاس اور عمدہ قیاس کرتے۔

لہٰذا جب امام صاحب کا طریقہ یہ ہو کہ وہ اپنی رائے پر قول صحابہ کو بھی مقدم سمجھتے ہیں تو وہ کیسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی مخالفت کر سکتے ہیں اور اسے مثلہ قرار دے سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ لوگوں نے اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ کے موقف کو سمجھا ہی نہیں ہے اسی لیے ان پر اعتراض کیا ہے، ہم اس مسئلہ میں امام صاحب کا اصل موقف عرض کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ امام صاحب نے کسی حدیث کی مخالفت نہیں کی ہے۔ اس مسئلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ہدی (قربانی کے جانور) کے لئے اشعار کرنا علامت مقرر کرنے کے لئے کوئی لازمی اور ضروری نہیں ہے اس کا درجہ محض جواز کا ہے۔ جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے جانوروں کو اشعار کیا لیکن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اپنا فتوی تخیر کا ہے کہ کرنا چاہو تو کرلو اور اگر چاہو تو نہ کرو۔

عن ابن عباس قال: ان شئت فاشعر الهدی وان شئت فلا تشعر

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۴ ص ۲۵۳، حدیث نمبر ۱۳۳۷۶)

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر چاہو تو ہدی کے جانور کا اشعار کرلو اور اگر چاہو تو نہ کرو۔ (ضروری نہیں ہے)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ شعار کرنا کوئی واجب اور ضروری حکم نہیں ہے وگرنہ صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مخالف کرنے کی اجازت نہ دیتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ اصلاً شعار کو مکروہ اور ناجائز نہیں سمجھتے بلکہ وہ جائز سمجھتے ہیں لیکن اس زمانہ میں لوگوں نے شعار کرنے میں بہت مبالغہ شروع کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے زخم سرایت کر جاتا اور وہ ہلاک ہو جاتا تھا اس قسم کے اشعار کو امام صاحب مکروہ اور ناجائز کہتے ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے موقف کو بیان کرتے ہوئے امام طحاوی الحنفی فرماتے ہیں

لم يكره ابو حنيفة اصل الاشعار وانما كره ما يفعل على وجه يخاف منه هلاك البدن كسراية الجرح لا سيما مع الطعن بالشفرة فاراد سد الباب عن العامة لانهم لا يراعون الحد فى ذلك واما من كان عارفا بالسنة فى ذلك فلا. (فتح البارى شرح صحيح البخارى جلد٥ ص٥٤٤، باب شعار البدن، مكتبة السلفية قاهره)

امام ابوحنیفہ اصل اشعار کو مکروہ نہیں سمجھتے (بلکہ جائز سمجھتے ہیں) امام صاحب اس طریقہ پر اشعار کو مکروہ سمجھتے ہیں جس (طریقہ) سے جانور کے ہلاک ہونے کا خوف ہو جیسا کہ زخم کے سرایت کر جانے سے (جانور کی موت واقع ہو جاتی ہے) خصوصاً تیز دھار نیزہ کے ساتھ (اشعار کرنے سے) تو امام ابوحنیفہ نے عام لوگوں کے (اس عمل کے) سد باب (روکنے) کا ارادہ فرمایا اس وجہ سے کہ عام لوگ اس (اشعار) کی حد کی رعایت نہیں کرتے ہیں۔
بہر حال وہ لوگ جو اشعار کا سنت طریقہ جانتے ہیں ان کے لئے کوئی حرج نہیں (یعنی وہ اشعار کر سکتے ہیں)

حافظ ابن حجر عسقلانی الشافعی (المتوفی ۸۵۲ھ) امام طحاوی کے مذکورہ قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

يتعين الرجوع الى ما قال الطحاوى فانه اعلم من غيره باقوال اصحابه.

(فتح البارى جلد٥ ص٥٤٥)

اور متعین ہے امام طحاوی کے قول کی طرف رجوع کرنا کیونکہ وہ اپنے فقہاء کے اقوال کے

مطالب کو دوسروں سے زیادہ جانتے ہیں۔

یعنی اس مسئلہ میں امام طحاویؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے حوالے سے جو بات فرمائی ہے اسی پر اعتماد کرنا ہوگا۔ ان تمام تر گفتگو سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی ہے کہ امام ابو حنیفہ نے حدیث سے ثابت شدہ اشعار کو مثلہ نہیں کیا بلکہ اس فعل کو مثلہ کہا ہے جس کے کرنے سے جانور ہلاک ہو جائے یا ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو یا اس کو تکلیف ہو۔ لہٰذا اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ پر مخالفت حدیث کا الزام درست نہیں ہے۔

(۹) صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہؒ نے دو روایت نقل کی ہیں جن میں سے وابصہ بن معبدؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

صلی رجل خلف الصف وحده فامره النبی صلی الله علیه وسلم ان یعید

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۶۸)

ایک شخص نے صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔

اعتراض:

ان روایت کو نقل کرنے کے بعد حافظ صاحبؒ امام ابو حنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "**ان ابا حنیفة قال تجزئه صلاته**" (ایضاً)

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنے والے کی نماز ہو جاتی ہے۔

جواب:

اس اعتراض کے دو جوابات ہیں۔

جواب نمبر ۱:

امام ابو حنیفہ کے نزدیک بھی صف کے پیچھے اکیلے نماز پڑھنا مکروہ ہے لیکن اس کے باوجود اگر کسی نے پڑھ لی تو نماز ہو جائے گی لیکن ایسی صورت میں نماز دوبارہ پڑھنا مستحب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا نماز کے صحیح ہونے کا فتویٰ حدیث کے موافق ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

حضرت حسن بصریؒ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ

عن ابی بکرۃ انہ انتھی الی النبی صلی اللہ علیہ سلم وھو راکع فرکع قبل ان یصل الی الصف فذکر ذلک للنبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال زادک اللہ حرصاً و لا تعد۔

(بخاری جلد اص ۱۰۸، باب اذا رکع دون الصف حدیث نمبر ۷۸۳)

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ (نماز پڑھنے کے لیے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت رکوع کی حالت میں تھے تو انہوں نے صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر لیا پھر اس کا ذکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تمہارا شوق زیادہ کرے لیکن دوبارہ ایسا نہ کرنا

اس حدیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی صف سے اکیلے نماز پڑھے تو نماز صحیح ہے کیونکہ اس واقعے میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ نے صف سے پیچھے اکیلے ہی نماز کی نیت باندھ لی تھی لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز دوبارہ لوٹانے کا حکم نہیں دیا لیکن آئندہ ایسا کرنے سے منع کیا کیونکہ ایسا کرنا بہتر نہیں ہے بلکہ صف میں مل کر نماز شروع کرنا چاہیے لہٰذا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز دوبارہ لوٹانے کا حکم نہ دینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اگر کوئی صف سے الگ اکیلے نماز بھی شروع کر دے تو نماز درست ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دوبارہ نہ کرنے کا حکم دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ عمل پسندیدہ نہیں ہے اور یہی امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے کہ اگر کوئی پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی لیکن مکروہ اور ناپسندیدہ عمل ہے۔

جواب نمبر ۲:

حافظ صاحبؒ نے جو دو روایت امام صاحبؒ کا رد کرنے کے لیے پیش کی ہیں۔ اس میں سے دوسری روایت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مسئلہ ہی درست ہے۔

ں روایت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص صف کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں کھڑے رہے اور جب اس آدمی نے نماز ختم کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اس روایت میں قابل غور بات یہ ہے کہ اگر صف کے پیچھے نماز پڑھنے والے کی نماز درست نہیں تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز کے ختم کرنے کا انتظار کیوں کر رہے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی کو اسی وقت فرما دیتے کہ تیری نماز درست نہیں ہے دوبارہ ادا کر لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا بلکہ نماز کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس آدمی کی پہلی نماز درست تھی اور دوسری مرتبہ نماز پڑھنے کا حکم استحباب پر محمول ہے کہ دوبارہ پڑھ لے تو بہتر ہے اور یہی امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔

(۱۰) حمل کے انکار کے وجہ سے لعان کرانا

حافظ ابن ابی شیبہؒ نے اس مسئلہ میں تین روایتیں نقل کی ہیں جن میں سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

ان النبی صلی الله علیه وسلم لا عن بالحمل.

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۶۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (میاں بیوی کے درمیان) لعان کروایا حمل (کے انکار) کی وجہ سے۔

اعتراض:

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد حافظ صاحبؒ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

ان ابا حنیفه کان لا یری الملاعنة بالحمل (ایضاً)

امام ابوحنیفہ حمل کے انکار کی وجہ سے (میاں بیوی کے درمیان) لعان کروانے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

جواب:

پہلی بات تو یہ ہے کہ محض حمل کے انکار پر لعان کروانے میں اختلاف ہے، بعض کی رائے لعان کروانے کی ہے اور جبکہ سفیان ثوریؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ کا مشہور مذہب اور امام محمد اور ایک روایت میں امام احمدؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔ اور اسی طرح ابن ماجشون مالکیہ میں سے اور زفر بن ہذیل ان حضرات کے نزدیک محض حمل کے انکار سے لعان کرانا درست نہیں ہے۔ (عمدۃ القاری جلد ۲۰ ص ۴۲۳ مکتبۃ السلفیہ)

اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ وغیرہ کا موقف یہ ہے کہ محض حمل کے انکار سے بات بالکل واضح نہیں ہوتی بلکہ لعان کرانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خاوند صاف اور واضح الفاظ میں بیوی پر زانی کا الزام لگائے اور یہ کہے کہ میری بیوی نے فلان آدمی کے ساتھ بدکاری کی ہے۔ محض حمل کے انکار سے لعان صحیح نہیں ہوگا کیونکہ ممکن ہے کہ کسی وجہ سے پیٹ پھول گیا ہو جس کی وجہ سے حمل ٹھہرنے کا گمان ہوتا ہے۔ **(النکت الطریقه)**

اور خاوند حمل کے حوالے سے غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہو لہٰذا اس خاوند کو صریح الفاظ میں کہنا پڑے گا کہ میرے نکاح میں آنے کے بعد میری بیوی نے زنا کا ارتکاب کیا ہے محض شک پر مبنی بیان سے لعان کرانا درست نہیں ہوگا جیسا کہ بخاری و مسلم میں روایت موجود ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے دلائل

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ

ان اعرابیا اتی النبی صلی الله علیه وسلم فقال: یارسول الله ان امراتی ولدت غلاما اسود وانی انکرته فقال له النبی صلی الله علیه وسلم هل لك من ابل قال نعم قال ما الوانها قال حمر قال فهل فیها من اورق قال نعم قال رسول الله صلی الله علیه وسلم فانّی هو قال لعله یا رسول الله یکون نزعه عرق له فقال له النبی صلی الله علیه وسلم وهذا لعله یکون نزعه عرق له

(صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۹۹، صحیح مسلم جلد ۱ ص ۴۹۱)

ایک دیہاتی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر ہوا اور اس نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری بیوی نے ایک کالے رنگ کے لڑکے کو پیدا کیا ہے اور میں اس لڑکے کا انکار کرتا ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیہاتی سے فرمایا کیا تیرے پاس اونٹ ہے اس نے کہا ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان اونٹوں کا رنگ کیا ہے اس نے کہا کہ سرخ رنگ کے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا ان میں کوئی خاکی رنگ کا بھی ہے اس نے کہا ہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ ان میں کہاں سے آ گیا تو اس شخص نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم شاید کہ کسی رگ نے اسے کھینچ لیا ہو تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی سے فرمایا اس بچے کو بھی شاید کسی رگ نے کھینچ لیا ہو۔

اس روایت سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ محض حمل کا انکار کرنے میں ابہام ہے لعان کے لیے کافی نہیں بلکہ لعان کے لئے لازمی ہے کہ شوہر کے الفاظ واضح اور صریح ہو کہ میری بیوی نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

ابن ابی شیبہ نے جو دو روایت بطور اعتراض کے نقل کی ہے وہ روایت مختصر ہے پوری روایت صحیح مسلم میں موجود ہے اور ان دونوں روایات کے مختلف طرق دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی روایت میں یہ قصہ عویمر بن عجلانی کا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما والی روایت میں یہ قصہ ہلال بن امیہ کا ہے۔

پہلی روایت:

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

انا لیلة الجمعة فی المسجد اذ جاء رجل من انصاری فقال لو ان رجلا وجد مع امرأته رجلا فتکلم جلدتموه او قتل قتلتموه وان سکت سکت علی غیظ واللہ لاسئلن عنه رسول الله صلی الله علیه وسلم فلما کان من الغد اتی رسول الله صلی الله علیه وسلم فسأله فقال لو ان رجلا وجد مع امرأته رجلا فتکلم جلدتموه او قتل قتلتموه او سکت سکت علی غیظ

فقال اللهم افتح وجعل يدعوا فنزلت آية اللعان (الی آخرہ)
(صحیح مسلم جلد۱ص۴۹۰،حدیث نمبر۳۷۵۵)

میں جمعہ کی رات مسجد میں تھا کہ انصار کا ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کہ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ کسی دوسرے آدمی کو پائے تو وہ کیا کرے اگر یہ بات کرے تو تم اسے کوڑے لگاؤ گے یا اگر اس نے قتل کر دیا تو تم اسے (قصاصاً) قتل کرو گے اور اگر وہ خاموش رہا تو سخت غصے میں خاموش رہے گا۔ اور اللہ کی قسم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے متعلق ضرور پوچھوں گا۔ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تھوڑی دیر بعد تشریف لائے تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر آدمی کو پائے اور وہ یہ بات کرے تو آپ اسے کوڑے لگائیں گے یا اسے قتل کر دے تو آپ اسے (قصاصاً) قتل کر دیں گے یا وہ خاموش رہے تو سخت غصے میں خاموش رہے گا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ تو اس مسئلہ کو کھول دے اور آپ دعا کرتے رہے پھر لعان کی آیت نازل ہوئی۔ (الی آخرہ)

دوسری روایت:

حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ

ذکر التلاعن عند رسول الله صلى الله وسلم فقال عاصم بن عدی فی ذلك قولاً ثم انصرف فأتاه رجل من قوم يشكو اليه انه وجه مع اهله رجلا فقال عاصم ما بتليت بهذا الا لقولی فذهب به الی رسول الله صلى الله عليه وسلم فاخبره بالذی وجد عليه امراته وكان ذلك الرجل مصفرا قليل اللحم سبط الشعر وكان الذی ادعی عليه انه وجد عند اهله خدلاً آدم كثير اللحم فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم الله بيّن فوضعت شبيها بالرجل الذی ذكر زوجها انه وجده عندها فلاعن رسول الله صلى الله عليه وسلم بينهما الی آخرہ) (مسلم جلد۱ ص۴۹۰)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پاس لعان کا ذکر کیا گیا تو عاصم بن عدی نے اس کی بات میں

کچھ کہا پھر وہ چلے گئے تو ان کی قوم کا ایک آدمی آیا اس نے ان سے شکایت کی کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو پایا ہے۔ تو حضرت عاصم نے فرمایا میں اپنی بات کی وجہ سے اس میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ پس حضرت عاصم اسے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلے گئے اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ اس نے اپنی بیوی کے ساتھ کسی آدمی کو پایا ہے اور آدمی دبلا پتلا، سیدھے بالوں والا تھا اور اس نے جس آدمی پر دعویٰ کیا کہ وہ اس کی بیوی پاس تھا وہ آدمی گندمی رنگ والا اور موٹے جسم والا تھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا اے اللہ (اس مسئلہ کو) واضح فرما دے پھر اس عورت نے بچہ جنا جو اس آدمی کے مشابہ تھا جس کے متعلق اس کے خاوند نے ذکر کیا کہ اس نے اپنی بیوی کے پاس آدمی کو پایا پھر انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آپس میں لعان کیا ہے۔

قارئین کرام! ان دونوں روایتوں میں خط کشید الفاظ سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ لعان محض حمل کے انکار پر نہیں ہوا تھا بلکہ خاوند نے بیوی پر صریح الفاظ میں زنا کا الزام لگایا تھا جس کی وجہ سے لعان کرایا گیا تھا اور امام ابوحنیفہ کا بھی یہی مذہب ہے جو حدیث کے موافق ہے۔

(۱۱) غلاموں کو آزاد کرنے میں قرعہ اندازی کرنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے دو حدیثیں نقل کی ہیں جن میں سے حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

حضرت عمران میں حصینؓ سے مروی ہے کہ

ان رجلا كان له ستة اعبد فاعتقهم عند موته فاقرع النبى صلى الله عليه وسلم بينهم فاعتق اثنين وارق اربعة (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۶۹)

ایک آدمی کے چھ غلام تھے تو اس نے اپنی وفات کے وقت ان سب کو آزاد کر دیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان غلاموں کے درمیان قرعہ اندازی فرمائی (اور ان میں سے) دو کو آزاد فرمایا۔

ان روایات کونقل کرنے کے بعد حافظ ابن ابی شیبہ امام ابوحنیفہ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ان ابا حنیفه قال، لیس هذا بشیء ولا یری فیه قرعة (ایضاً)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں قرعہ اندازی ڈالنے کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

جواب:

اس حدیث میں دو باتوں کا ذکر ہے ایک یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثلث مال میں وصیت نافذ کی تو اس ثلث میں امام ابوحنیفہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ دوسرا مسئلہ کہ آزاد کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرعہ اندازی فرمائی تو یاد رکھے کہ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ نے شریعت کے مسلمہ اصول پر عمل کیا ہے شریعت کا مسلمہ اصول ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کے تیسرے حصے کے متعلق وصیت کرے کہ میرے مرنے کے بعد یہ مال فلاں شخص کو دے دیا جائے تو اس کے لئے یہ وصیت کرنا جائز ہے اور اگر اس نے تیسرے حصے سے زیادہ کی وصیت کی تو یہ وصیت جائز نہیں اور نہ ہی نافذ ہوگی۔

اس وجہ سے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ غلاموں کو تقسیم کر کے تہائی حصہ نکالنے کے بجائے ہر غلام کی قیمت کے مطابق اس کے تیسرے حصہ کو آزاد کیا جائے اور باقی دو تہائی قیمت ہر غلام کے ذمہ واجب ہوگی جس کو وہ مزدوری کر کے میت کے ورثا کو ادا کرے گا جس کے بعد وہ غلام آزاد ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر جیسا کہ حدیث میں چھ غلاموں کا ذکر موجود ہے تو اگر ایک شخص کے چھ غلام ہوں اور ہر ایک کی قیمت نو سو روپے ہوں تو تہائی حصہ آزاد ہو چکا ہے یعنی تین سو اور باقی چھ سو روپے ہر غلام کو محنت مزدوری کر کے ورثاء کو ادا کرنے ہوں گے۔

ان سب باتوں سے معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ہر غلام کی قیمت کا تیسرا حصہ آزاد ہوگا اور آزاد ہونے کے بعد ہر غلام کو باقی دو حصوں کی قیمت ادا کرنا ضروری ہوگی نہ کہ غلاموں کی کل تعداد کا تیسرا حصہ آزاد ہوگا۔

امام ابو حنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ۱:

حافظ عبدالرزاق ابن ہمام (المتوفی ۲۱۱ھ) نقل فرماتے ہیں کہ

ان رجلاً منهم اعتق عند موته غلاما له لم يكن له مال فرفع ذلك الى النبي صلى الله عليه وسلم فاعتق ثلثة و امره ان يسعى فى الثلثين

(مصنف عبدالرزاق جلد ۹ ص ۱۵۲، مطبوعہ المجلس العلمی، فتح الباری جلد ۵ ص ۱۵۹، مکتبہ السلفیہ)

بنی عذرہ میں سے ایک آدمی نے اپنے ایک غلام کو آزاد کر دیا اور اس کے پاس غلام کے علاوہ کوئی مال نہ تھا تو اس بات کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسرے حصہ کو آزاد فرمایا اور دو تہائی کی (قیمت ادا کرنے کے لیے) مزدوری کرنے کا حکم فرمایا۔

دلیل نمبر ۲:

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا فتوی

عن الحسن عن ابن مسعود قال: يعتق ثلاثة

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۵ ص ۲۰۶ مکتبہ امدادیہ)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تیسرے حصے کو آزاد کیا جائے گا۔

دلیل نمبر ۳:

مشہور تابعی حضرت ابراہیم نخعی (المتوفی ۹۶ھ) فرماتے ہیں۔

يعتق ثلثه ويسعى فى ثلثية (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۵ ص ۲۰۶)

تیسرے حصہ کو آزاد کیا جائے گا اور بقیہ دو تہائی (کی قیمت ادا کرنے) میں غلام محنت مزدوری کرے۔

دلیل نمبر ۴:

خلفاء راشدین کے دور خلاف کے مشہور قاضی اور تابعی حضرت قاضی شریح کا فیصلہ

وقال شریح: اجیز ثلثة و استسعیه فی ثلثیه

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۵ ص ۲۰۶)

قاضی شریح فرماتے ہیں کہ ایک تہائی میں آزادی درست ہے۔ اور دو تہائی (کی قیمت ادا کرنے) میں غلام سے محنت مزدوری کا مطالبہ کیا جائے گا (تا کہ وہ دو تہائی کی قیمت ادا کر سکے)

یہ وہ احادیث و آثار ہیں جن کی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ہر غلام کا تیسرا حصہ آزاد ہو گا اور غلاموں کو باقی دو حصہ کی قیمت ادا کرنی ہو گی۔

اب سوال یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے ابن ابی شیبہ کی نقل کردہ احادیث پر عمل کیوں نہیں کیا اور ان روایات کا کیا جواب ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

پہلا جواب:

یاد رہے کہ حدیث کو رد یا قبول کرنے کے امام ابو حنیفہ کے جہاں بہت سے اصول ہیں وہی ایک اصول یہ بھی ہے کہ اگر کوئی روایت یا خبر واحد شریعت کے مسلمہ اصول کے خلاف ہو تو وہ قابل عمل نہیں ہے۔

چنانچہ قاضی ابوزید دبوسیؒ الحنفی (المتوفی ۴۳۰ھ) فرماتے ہیں:

اصل عند اصحابنا ان خبر الآحاد متی ورد مخالفا لنفس الاصول لم یقبل اصحابنا. (تأسیس النظر ص ۱۵۶ مکتبہ دار زیدون)

ہمارے اصحاب کے ہاں یہ ہے کہ جب خبر واحد نفس اصول کے خلاف ہو تو اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

اس اصول کے پیش نظر امام ابو حنیفہؒ ابن ابی شیبہؒ کی بیان کردہ روایت پر عمل نہیں کرتے

کیونکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ غلاموں کے درمیان قرعہ اندازی والی حدیث شریعت کے مسلمہ قاعدہ اور اصول کہ مرنے والا اپنا مال تیسرے حصے سے زیادہ غیر ورثاء کو نہیں دے سکتا کے خلاف ہے کیونکہ قرعہ اندازی کی صورت میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ غیر ورثاء کے پاس تیسری حصے سے زیادہ مال چلائے گا۔

آپ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص کے پاس چھ غلام ہیں اور ان میں سے تین کی قیمت ہزار ہزار روپے اور تین کی قیمت پانچ پانچ سو روپے ہیں تو اب تمام غلاموں کی قیمت پنتالیس سو روپے بنے گی جس کا تیسرا حصہ پندرہ سو روپے ہیں۔

اب اگر ان غلاموں میں قرعہ اندازی کی جائے اور قرعہ ہزار روپے قیمت والے دو غلاموں کا نکل آئے صاف بات ہے کہ غیر ورثاء کو تیسرے حصہ سے زیادہ یعنی پانچ سو روپے زیادہ مل جائے گا اور یہ شریعت اسلامیہ کے مسلمہ اصول کے خلاف ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

دوسرا جواب:

حضرات عمران بن حصین والی روایت جس میں قرعہ اندازی کا ذکر موجود ہے اس کے متعلق امام طحاوی الحنفی (المتوفی ۳۲۰ھ) فرماتے ہیں کہ

ان ما ذكروا من القرعة المذكورة في حديث عمران منسوخة لان القرعة قد كانت في بدء الا سلام (طحاوی جلد۴ ص۳۸۲، مکتبہ عالم الکتب)

عمران بن حصین والی روایت میں جس قرعہ اندازی کا تذکرہ ہے وہ منسوخ ہے اس لئے کہ قرعہ اندازی شروع اسلام میں تھا پھر منسوخ ہو گیا۔

اور آگے امام طحاوی قرعہ کے منسوخ ہونے کی دلیل دیتے ہوئے فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یمن سے ایک شخص حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا ان دنوں حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن میں تھے اور اس آدمی نے بتایا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس تین لوگ آئیں جو ایک ہی بچہ کے بارے میں جھگڑ رہے تھے اور انہوں نے ایک ہی لونڈی کے ساتھ ایک ہی طہر میں جماع کیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قرعہ ڈال کر فیصلہ فرمایا یہ سن کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر ہنسے کہ آپ

کے نواجذ یا اضراس ظاہر ہوگئیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کے بارے حضرت علی کے قرعہ اندازی والے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔اس سے ثابت ہوا کہ اس وقت حکم اسی طرح تھا۔

اس کے بعد امام طحاوی فرماتے ہیں کہ

ثم نسخ بعد باتفاقنا و اتفاق هذا المخالف لنا و دلّ علی نسخة ما قد روینا فی باب القافة، من حکم علی فی مثل هذا بان جعل الولد بین المدعیین جمیعا یرثهما و یرثانه فدل ان الحکم کان یومئذ حکم علی بما حکم فی کل شیء (طحاوی جلد۲ص ۳۸۲)

پھر بالاتفاق یہ منسوخ ہوگیا اور اس کے منسوخ ہونے پر یہ روایت دلالت کرتی ہے جو باب القافہ میں ہم نے ذکر کردی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس جیسے معاملے کے بارے میں فیصلہ فرمایا کہ ایک لڑکے کے بارے میں دو دعوے دار تھے تو آپ نے فرمایا وہ لڑکا دونوں کا وارث ہوگا اور دونوں اس لڑکے کے وارث بنیں گے پس یہ واقعہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان دنوں حکم ہر چیز کا ایسا ہی تھا جیسا حضرت علی نے فیصلہ کیا ہے (یعنی بغیر قرعہ اندازی کے)

اس روایت سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی ہے کہ قرعہ اندازی کے ذریعے فیصلہ کرنا پہلے درست تھا لیکن بعد میں منسوخ ہوگیا ہے اگر منسوخ نہ ہوا ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس فیصلہ کے خلاف نہ کرتے جس فیصلہ پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشی کا اظہار فرما کر اس کی توثیق فرمادی ہو۔

قارئین کرام! ہماری تمام گفتگو سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب حدیث کے موافق ہی ہے۔

(۱۲) باندی پر حد جاری کرنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے پانچ روایات نقل کی ہے ہیں جن میں سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں

كنا عند النبى صلى الله عليه وسلم فاتاه رجل فسأله عن الامة تزنى قبل ان تحصن قال: اجلدوها فان عادت فاجلدوها قال فى الثالثة او الرابعة فبيعوها ولو بضفير (مصنف ابن ابی شیبہ جلد۸ ص۳۶۹)

ہم حضور صلی اللہ علیہ سلم کے پاس موجود تھے تو ایک آدمی آیا اور اس نے اپنی باندی کے متعلق سوال کیا جس نے نکاح سے قبل زنا کیا تو اس باندی کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اسے کوڑے لگاؤ اگر دوبارہ کرے تو پھر کوڑے لگاؤ پھر فرمایا تین چار مرتبہ تک کوڑے لگاؤ (اگر پھر زنا کرنے) تو اسے بیچ دو اگرچہ اس کی قیمت ایک رسی ہی کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد حافظ ابن ابی شیبہ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

ان با ابا حنيفه قال لا يجلدها سيدها (ایضاً)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا آقا اپنی باندی کو کوڑے نہ لگائے۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ حدود کا نافذ کرنا یہ صرف حاکم وقت کی ذمہ داری ہے نہ کہ ہر عام آدمی کی اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ آقا اپنی باندی کو کوڑے نہ لگائے۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ۱:

سورہ مائدہ آیت نمبر ۳۸

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (المائدہ:۳۸)

اور جو مرد چوری کرے اور جو عورت چوری کرے دونوں کے ہاتھ کاٹ دو تاکہ ان کو اپنے

کئے کا بدلہ ملے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا ہو اور اللہ صاحب اقتدار بھی ہے
صاحب حکمت بھی ہے۔

سورہ النور آیت نمبر۲

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (النور:۲)

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد دونوں کو سو سو کوڑے لگاؤ اور اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے دین کے معاملے میں ان پر ترس کھانے کا کوئی جذبہ تم پر غالب نہ آئے۔ اور یہ بھی چاہیے کہ مومنوں کا ایک مجمع ان کی سزا کو کھلی آنکھوں دیکھے۔

طرز استدلال:

امام ابو حنیفہ کا استدلال مذکورہ آیات سے ہے جس میں حدود کے جاری کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ ان آیات میں جو حدود کے جاری کرنے کا حکم ہے وہ عام ہے۔ یعنی جس طرح کسی عام آدمی کو چور کا ہاتھ کاٹنے اور زانی کو کوڑے لگانے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ حدود کا جاری کرنا حاکم وقت کے ذمہ ہے۔ بالکل اسی طرح کوئی مالک خود اپنے غلام پر حد جاری نہیں کرسکتا۔

اور یاد رکھیں کے اس بات پر فقہا کا اتفاق ہے کہ ان آیات کا مصداق عام آدمی نہیں بلکہ حاکم وقت ہی ہے۔

دلیل نمبر۲:

صحابی رسول حضرت ابو عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

الزکاۃ والحدود والفئی والجمعۃ الی السلطان

(فتح الباری جلد۱۲ص۱۶۳ مکتبہ السلفیہ)

زکوۃ وصول کرنا، حدود جاری کرنا، فئے کا انتظام کرنا اور جمعہ پڑھانا حاکم وقت کے ذمہ

ہے۔

دلیل نمبر۳:

حضرت حسن بصریؒ (المتوفی ۱۱۰ھ) فرماتے ہیں

اربعة الی السلطان الزکاة، والصلوة، والحدود والقضاء

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد۶ ص ۵۰۷)

زکوٰۃ وصول کرنا، نماز پڑھانا، حدود اور قضاء جاری کرنا حاکم کی ذمہ داری ہے۔

دلیل نمبر۴:

حضرت ابن محیریز فرماتے ہیں

الجمعة، والحدود، والزکاة والفئی، الی السلطان

(ابن ابی شیبہ جلد۶ ص ۵۰۷)

جمعہ پڑھانا، حدود جاری کرنا، زکوۃ وصول کرنا، فئے کا انتظام کرنا حاکم کے ذمہ ہے۔

دلیل نمبر۵:

حضرت عطاء ابن رباح (المتوفی ۱۱۴ھ) فرماتے ہیں

الی السلطان الزکاة والجمعة، والحدود. (ابن ابی شیبہ جلد۶ ص ۵۰۷)

زکوۃ وصول کرنا، جمعہ کا قیام اور حدود جاری کرنا حاکم کی ذمہ داری ہے۔

ان روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا موقف قرآن وحدیث کے موافق ہے۔

رہی وہ احادیث جو حافظ ابن ابی شیبہؒ نے نقل کی ہے اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں:

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

ان روایات کا جواب دیتے ہوئے صاحب مظاہر حق نواب قطب الدین خان دہلوی الحنفی (المتوفی ۱۲۸۹ھ) فرماتے ہیں کہ احناف کے ہاں یہ حکم کہ پھر آقا غلام پر حد جاری کرے سبب پر محمول ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ آقا اپنی زانیہ لونڈی پر حد کے اجرا کا سبب اور واسطہ بنے اس طرح کہ وہ اس کو حاکم کے پاس پیش کرے تا کہ وہ اس پر حد جاری

کرے۔ (مظاہر حق جلد۳ ص ۶۷۹، حدود کا بیان)

قارئین کرام! یہ توجیح عمدہ توجیح ہے اس کی وجہ سے احادیث وآثار میں اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔

(۱۳) پانی کی نجاست کا مسئلہ

حافظ ابن ابی شیبہ نے اس مسئلہ میں تین روایات نقل کی ہیں۔

پہلی روایت:

حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ہے

قیل: یا رسول الله انتوضأ من بئر بضاعه وهی بئر یلقی فیها الحیض ولحوم الکلاب والنتن فقال النبی صلی الله علیه وسلم الماء طهور لا ینجسه شیء

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کیا ہم وضو کر سکتے ہیں بضاعہ نامی کنویں سے حالانکہ اس کنویں میں حیض والے کپڑے اور کتے کا گوشت اور بدبودار چیزیں پھینکی جاتی ہیں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانی پاک ہے اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔

دوسری روایت:

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ

اغتسل بعض ازواج النبی صلی الله علیه وسلم فی جفنة فجاء النبی صلی الله علیه وسلم لیغتسل فیها او لیتوضا، فقالت یا رسول الله صلی الله علیه وسلم انی کنت جنبا قال ان الماء لا یجنب

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی زوجہ نے ایک برتن میں غسل کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تاکہ اس برتن سے غسل یا وضو کرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نے حالت جنابت میں تھی (یعنی میں نے اس پانی سے غسل جنابت کیا ہے) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے شک پانی میں جنابت نہیں آتی۔

تیسری روایت:

حضرت عبداللہ بن عمر اپنے والد حضرت عمر سے روایت کرتے ہیں۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا كان الماء قلتين لم يحمل نجسًا.

جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب پانی دو مٹکے ہو تو وہ نجاست قبول نہیں کرتا۔

ان روایت کو نقل کرنے کے بعد ابن ابی شیبہ امام ابو حنیفہ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان ابا حنيفة قال ينجس الماء (ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۰)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ (نجاست گرنے سے) پانی ناپاک ہو جاتا ہے۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے اگر تھوڑے پانی میں نجاست گر جائے تو وہ ناپاک اگر چہ اس کا رنگ، بو اور ذائقہ تبدیل نہ بھی ہو اور اگر پانی زیادہ ہو یا جاری ہو تو اس میں اگر نجاست گر جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا ہاں اگر اس کا رنگ یا بو یا ذائقہ تبدیل ہو جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے جیسا کہ امام قدوری الحنفی (المتوفی ۴۲۸ھ) فرماتے ہیں

وكل ماء دائم وقعت فيه النجاسته لم يجز الوضوء به قليلا كانت النجاسة او كثيرا (الى ان قال) والماء الجارى اذا وقعت فيه النجاسة جاز الوضوء منه اذا لم ير لها اثر (قدوری ص ۵ مکتبۃ الحسن)

ٹھہرے ہوئے پانی میں نجاست گر جائے تو اس سے وضو جائز نہیں ہے۔ نجاست چاہیے تھوڑی ہو یا زیادہ (آگے مزید فرماتے ہیں) جاری پانی میں جب نجاست گر جائے تو اس سے وضو کرنا جائز ہے جب تک اس میں (نجاست کا) اثر نہ دیکھے (یعنی رنگ یا ذائقہ یا بو تبدیل نہ ہو)

اور علامہ علاء الدین الکاسانی الحنفی (المتوفی ۵۸۷ھ) فرماتے ہیں:

ان کان قلیلاً ینجس و ان کان کثیراً لا ینجس

(بدائع الصنائع جلد ۱ ص ۲۱۷ دار الکتب)

اگر پانی تھوڑا ہو تو نجاست کے گرنے سے ناپاک ہو جائے گا اور اگر زیادہ ہو تو ناپاک نہ ہوگا (جب تک رنگ کا ذائقہ یا بو تبدیل نہ ہو)

جاری پانی کے مسئلہ میں تو کسی کا اختلاف نہیں ہے اختلاف اس بات پر ہے کہ اگر تھوڑے یا ٹھہرے ہوئے پانی میں نجاست گر جائے وہ پاک ہے یا ناپاک اور امام صاحب کا مذہب ناپاک ہونے کا جیسا کہ گزر چکا ہے۔

اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ ؒ کا استدلال حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث سے ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

امام ابو حنیفہ ؒ کے دلائل

دلیل نمبر ۱:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا استیقظ احدکم من نومه فلا یغمس یده فی الاناء حتی یغسلها ثلاثا فانه لا یدری این باتت یده

(مسلم جلد ۱ ص ۱۳۶ باب جواز الصلوٰۃ علی کلها بوضوء واحد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی ایک اپنی نیند سے بیدار ہو تو اپنے ہاتھ کو برتن میں نہ ڈالے یہاں تک کہ وہ اس کو تین مرتبہ دھولے کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری ہے۔

دلیل نمبر ۲:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

نهی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبال فی الماء الراکد.

(مسلم جلد ۱ ص ۱۳۸، باب النهی عن البول فی الماء الراکد)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔

دلیل نمبر ۳:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

عن النبی صلی الله علیه وسلم قال لا یبولن احد کم فی الماد الدائم ثم یغتسل منه (مسلم جلد ا ص ۱۳۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا تم میں سے کوئی ٹھہرے ہوئے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کرے کہ پھر اس سے غسل کرے۔

دلیل نمبر ۴:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا یغتسل احد کم فی الماء الدائم وهو جنب فقال کیف یفعل یا ابا هریرة قال یتناوله تناولا (مسلم جلد ا ص ۱۳۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے کوئی بھی حالت جنابت میں ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل نہ کرے کسی نے پوچھا کہ وہ آدمی غسل کیسے کرے گا تو آپ نے فرمایا اس سے علیحدہ پانی لے لے (اور غسل کرے)

دلیل نمبر ۵:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

قال رسول الله علیه وسلم ولغ الکلب فی اناء احد کم فلیرقه ثم یغسله سبع مرار (مسلم جلد ا ص ۱۳۷)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا جب کتا تم میں سے کسی کے برتن میں منہ ڈال دے تو اس کو بہادو پھر اس برتن کو سات مرتبہ دھوؤ۔

ان تمام روایات میں اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اگر تھوڑے پانی یا ٹھہرے ہوئے پانی میں نجاست گر جائے تو وہ فوراً ناپاک ہو جاتا ہے اس کا رنگ ذائقہ، بو تبدیل نہ بھی ہو۔ کیونکہ ان روایات میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سو کرا ٹھنے

والے کو برتن میں ہاتھ ڈالنے سے منع فرمایا کیونکہ امکان ہے کہ اس کے ہاتھ میں نجاست لگی ہو اور اس سے برتن ناپاک ہو جائے گا اور اسی طرح حالت جنابت میں ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل کرنے سے منع فرمایا تا کہ نجاست پانی میں نہ گر جائے اور کتا کسی برتن میں منہ مار دے تو اس میں موجود پانی کو بہانے اور برتن کو سات مرتبہ دھونے کا حکم فرمایا حالانکہ ان تمام چیزوں سے نہ پانی کا ذائقہ بدلتا ہے نہ ہی اس کا رنگ اور نہ ہی اس کی بو میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ تھوڑا پانی اور ٹھہرے ہوئے پانی میں اگر نجاست گر جائے تو وہ نجس ہو جاتا ہے جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے۔

رہی وہ احادیث جو حافظ ابن ابی شیبہ نے امام ابوحنیفہ کی مخالفت میں نقل کی ہے اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

ابن ابی شیبہ نے جو پہلی روایت بئر بضاعہ والی نقل کی ہے اس روایت سے امام ابوحنیفہ پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا اس روایت کے دو جواب ہیں۔

جواب نمبرا:

اس کنویں میں پانی مستقل طور پر نہیں ٹھہرتا تھا کہ کثرت استعمال کی وجہ سے اس کے پانی کا حکم جاری پانی کی طرح ہے اور جاری پانی میں نجاست پڑ جائے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا جب تک کہ اوصاف ثلاثہ میں سے کوئی وصف تبدیل نہ ہو جائے چنانچہ امام طحاوی الحنفیؒ فرماتے ہیں

اما ما ذکرتموہ من بئر بضاعة فلا حجة لکم فیه لان بئر بضاعة قد اختلف فیھا ما کانت قال قوم کانت طریقاً للماء الی البساتین فکان الماء لا یستقر فیھا فکان حکم مائھا کحکم ماء الانھار

(طحاوی جلد اص۱۲، مکتبہ رحمانیہ)

تم نے بیر بضاعہ والی حدیث کا ذکر کیا اس میں تمہارے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

کیونکہ بئر بضاعہ کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے کہا کہ یہ کنواں باغات کی طرف جانے والے راستے میں تھا اور پانی اس میں ٹھہرتا نہیں تھا بس اس کنویں کے پانی کا حکم جاری پانی کی طرح ہے۔ (یعنی باغات کے استعمال کے لیے کثرت اخراج کی وجہ سے)

طحاوی کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ بیر بضاعہ کے پانی کو کثرت سے نکالا جاتا تھا باغات کو لگانے کے لیے تو جب پانی مستقل طور پر ٹھہرتا ہی نہیں تھا تو اب وہ جاری پانی کے حکم میں تھا اور جاری پانی میں نجاست گر جائے تو بالاتفاق نجس نہیں ہوتا۔

جواب نمبر۲:

بئر بضاعہ میں نجاست کے ڈالے جانے کا واقعہ صحابہ کرام کے سامنے پیش نہیں آیا تھا بلکہ پہلے کسی وقت میں اس کنویں میں گندگی ڈالی جاتی تھی تو صحابہ کرام کو اشکال پیدا ہوا کہ آیا یہ اب بھی پاک ہے یا ناپاک تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پاک ہے۔ کیونکہ کثرت اخراج کی وجہ سے پانی میں نجاست کا اثر بالکل ختم ہو چکا ہے اس لئے اس کنویں کا پانی پاک ہے اسے استعمال کر سکتے ہو۔

کتے کا گوشت اور گندگی صحابہ کرام کے سامنے گرے ہوتے تو پانی کا رنگ ذائقہ یا بو ضرور تبدیل ہو جاتی اور اوصاف ثلاثہ میں کسی بھی وصف کے تبدیل ہونے سے کنویں کا پانی بھی بالاتفاق نجس ہو جاتا ہے۔

چنانچہ امام طحاویؒ امام واقدیؒ کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں

قد اجمعوا ان النجاسة اذا وقعت فی البئر فغلبت علی طعم مائها او ریحه او لونه ان ماءها قد فسد ولیس فی حدیث بئر بضاعة من هذا شیء انما فیه ان النبی صلی الله علیه وسلم سئل عن بئر بضاعة فقیل له : انه یلقی فیها الکلاب والمحائض فقال (ان الماء لا ینجسه شیء) ونحن نعلم ان بئرا لو سقط فیها ما هو اقل من ذلك لکان محالا ان لا یتغیر ریح مائها وطعمه وهذا مما یعقل ویعلم (طحاوی جلد۱ ص۱۲ مکتبہ رحمانیہ)

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جب نجاست کنویں میں گر جائے اور اس کے ذائقہ یا بو یا رنگ کو تبدیل کر دے تو اس کا پانی نجس ہو جائے گا اور بئر بضاعہ (والے واقعہ) میں ان میں سے کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ اس میں صرف اتنی بات ہے کہ بئر بضاعہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اس میں کتے اور حیض والے کپڑے ڈالے جاتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانی کو کوئی چیز نجس نہیں کر سکتی اور ہم جانتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی کسی کنویں میں گر جائے جو ان سے بھی کم ہو تو یہ بات ناممکن ہے کہ اس کنویں کا ذائقہ اور بو تبدیل نہ ہو یہ بات تو عقل سے بھی پہچانی جاتی ہے۔

اور اسی طرح صاحب مظاہر حق علامہ نواب قطب الدین خان الحنفی بئر بضاعہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

یہ کنواں بہت زیادہ پانی والا تھا اور چشمہ دار تھا اور جاری تھا جو گندگی اس میں گر جاتی تو بہہ کر آگے چلی جاتی تھی اور بعض علماء کی تحقیق کے مطابق یہ کنواں نہر جاری کی طرح تھا اور اس کا پانی ایک باغ میں بہتا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اس کا پانی پاک ہے گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماء کثیر والا جواب دیا کہ جو پانی جاری ہو تو ماء کثیر ہوتا ہے اور ماء کثیر کا حکم یہی ہے آگے مزید فرماتے ہیں کہ

اس حدیث میں (ان الماء طہور لا ینجسہ شیء) کے عموم سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ وقوع نجاست سے کوئی پانی نجس نہیں ہوتا چاہے وہ قلیل ہو یا کثیر ہو بلکہ یہ حکم ماء کثیر کا ہے کہ وقوع نجاست سے نجس نہیں ہوتا ماء قلیل کا یہ حکم نہیں ہے اور احناف کے نزدیک چشمہ دار کنواں ماء جاری کے حکم میں ہوتا ہے اس کا وہی حکم ہوگا جو کہ ماء جاری کا ہے۔

(مظاہر حق جلد ا ص ۳۷۴)

ان حوالہ جات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس وقت اس کنویں میں نجاست کا اثر موجود نہیں تھا کثرت اخراج کی وجہ سے اسی وجہ سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانی پاک ہے اور کوئی چیز اسے ناپاک نہیں کرتا۔

دوسری روایت کا جواب:

یہ حدیث امام ابوحنیفہ کے مذہب کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس حدیث میں صرف اس بات کا ذکر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی زوجہ نے غسل جنابت کیا اور برتن میں کچھ پانی بچ گیا اور ان کا گمان تھا کہ شائد غسل جنابت سے بچا ہوا پانی نجس ہوتا ہے۔ تو ان کے اس گمان یا وہم کی تردید کے لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانی میں جنابت نہیں آتی۔ اس حدیث میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ بچے ہوئے پانی میں نجاست گرگئی ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کو پاک فرمایا ہو۔

تیسری روایت کا جواب:

اس روایت کے مختلف جوابات ہیں:

پہلا جواب:

اس روایت کی سند میں اضطراب ہے۔

(۱) ترمذی جلد ا ص ۲۱، اور ابوداؤد جلد ا ص ۹ کی روایت میں ہے۔

عن محمد بن اسحاق، عن محمد بن جعفر بن زبیر عن عبید اللہ بن عبداللہ بن عمر

(۲) عن محمد بن جعفر بن زبیر عن عبداللہ ابن عبداللہ ابن عمر

(دارقطنی جلد ا ص ۵۵، مکتبہ دار المعرفہ)

(۳) عن محمد بن عباد بن جعفر عن عبداللہ بن عبداللہ بن عمر (دارقطنی جلد ا ص ۵۸)

(۴) عن محمد بن اسحاق، عن الزہری، عن سالم عن عبداللہ بن عمر۔ (دارقطنی جلد ا ص ٦۹)

(۵) عن محمد بن اسحاق، عن الزھری، عن عبید اللہ بن عبداللہ عن ابی ہریرہ

دوسرا جواب:

اس روایت کے متن میں اضطراب ہے۔

(۱) ابوداؤد جلد ا ص ۹ کی روایت میں ہیں "**اِذا کان الماء قلتین لم یحمل الخبیث**"

(۲) دارقطنی جلد ا ص ٦۸ میں ہے، "**ما بلغ الماء قلتین فما فوق ذلك**"

(۳) دارقطنی جلد۱ص۷۰ کی روایت میں ہے: "اذا بلغ الماء قلتین او ثلاثا"

(۴) دارقطنی جلد۱ص۷۸ "اذا بلغ الماء اربعین قلة"

(۵) دارقطنی جلد۱ص۸۱ "اربعین غربا"

(۶) دارقطنی جلد۱ص۸۱ "اربعین دلوًا" آتا ہے۔

(۷) دارقطنی جلد۱ص۷۵ "اذا کان الماء قلتین فصاعدًا"

ان روایات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ اس روایت کی سند اور متن میں اضطراب ہے اور اضطراب ہونا روایت کے ضعیف ہونے کی علامت ہے۔

تیسرا جواب:

یہ روایت ٹھہرے ہوئے پانی اور برتنوں میں موجود پانی کے متعلق نہیں ہے بلکہ چشموں اور صحراء کے جاری پانی کے بارے میں ہے جیسا کہ ترمذی میں روایت موجود ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو يسأل عن الماء يكون في الفلاة من الارض وما ينوبه من السباع والدواب قال اذا كان الماء قلتين لم يحمل الخبث (ترمذی جلد۱ص۲۱)

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے میدان میں موجود پانی کے متعلق پوچھا گیا جس پر پرندے آتے جاتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب پانی دو قلہ ہو تو وہ نجاست کو نہیں اٹھاتا۔

اس روایت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت صحراء میں موجود ندی نالوں کے جاری پانی کے بارے میں ہے نہ کہ ٹھہرے ہوئے برتنوں میں موجود پانی کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح فرمان ہے کہ برتن میں موجود پانی میں ہاتھ نہ ڈالیں اور کھڑے پانی میں پیشاب نہ کرے جیسا کہ روایات پہلے گزر چکی ہیں۔

اس حدیث کا اصل تعلق پانی کی قلت وکثرت سے ہے۔ اور امام شافعی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں کہ جب ندی نالے کا پانی کم از کم دو قلہ ہو تو نجس نہیں ہوتا۔

جبکہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک پانی کی قلت وکثرت کا اختیار مبتلی بہ کی رائے پر موقوف ہے چنانچہ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ **یعتبر فیہ اکبر رای المبتلی بہ.**

(بحرالرائق جلد ۱ ص ۱۳۷، قدیمی کتب خانہ)

کہ پانی کی قلت وکثرت کے بارے میں مبتلی بہ کی رائے کا اعتبار ہوگا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کے نزدیک قلتین والی روایت کو پانی کی قلت یا کثرت میں دلیل بنانا درست نہیں ہے کیونکہ قلتین کے معنی میں اختلاف ہے۔

علامہ زیلعیؒ نصب الرایہ جلد ۱ ص ۱۱۰ میں لکھتے ہیں کہ قلہ بمعنی جرہ ج جرار یعنی گھڑا ہے اور قلہ بمعنی مشک ہے اور قلہ بمعنی رأس الجبل یعنی پہاڑ کی چوٹی بھی ہے۔

(بحوالہ خزائن السنن جلد ۱ ص ۱۳۹)

اور اسی طرح علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ قلہ اس برتن پر بھی بولا جاتا ہے جس سے پانی لے کر اٹھایا جائے مثلاً جگ، گلاس، لوٹا وغیرہ

(معالم السنن جلد ۱ ص ۵۷، بحوالہ خزائن السنن)

اس روایت کے متعلق صاحب مظاہر حق نواب قطب الدین حنفی فرماتے ہیں کہ جہاں تک اس حدیث کا تعلق ہے اس کے بارے میں علماء کا بہت زیادہ اختلاف ہے کہ آیا یہ حدیث صحیح بھی ہے یا نہیں؟ چنانچہ سفر السعادہ کے مصنف جو ایک جلیل القدر محدث ہیں لکھتے کہ "علماء کی ایک جماعت کا قول تو یہ ہے کہ حدیث صحیح ہے مگر ایک دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے"۔

علی بن مدینیؒ نے جو جلیل القدر علماء اور ائمہ حدیث کے امام اور حضرت امام بخاری کے استاد ہیں لکھا ہے کہ "یہ حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہی نہیں ہے۔

نیز علماء لکھتے ہیں کہ یہ حدیث اجماع صحابہ کے برخلاف ہے کیونکہ ایک مرتبہ چاہ زم زم میں ایک حبشی گر پڑا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما نے یہ حکم دیا کہ کنویں کا تمام پانی نکال دیا جائے اور یہ واقعہ اکثر صحابہ کے سامنے ہوا اور کسی نے اس حکم کے مخالفت نہیں کی۔

صاحب مظاہر حق مزید فرماتے ہیں کہ: امام طحاوی جوفن حدیث کے ایک جلیل القدر امام اور حنفی مسلک تھے فرماتے ہیں کہ

حدیث قلتین یعنی یہ حدیث اگر چہ صحیح ہے لیکن اس پر ہمارے عمل نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں پانی کی مقدار دو قلہ بتائی گئی ہے اور قلہ کے کئی معنی آتے چنانچہ قلہ مٹکے کو بھی کہتے ہیں اور مشک کو بھی، نیز پہاڑ کی چوٹی بھی قلہ کہلاتی ہے۔

لہٰذا جب یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں حدیث میں قلہ سے کیا مراد ہے تو اس پر کیسے عمل ہو سکتا ہے۔ (مظاہر حق جلد ۱ ص ۱۷۴ مکتبۃ العلم)

جب اس حدیث کی سند متن اور معنی میں اتنا اختلاف ہے تو اس حدیث کو طہارت اور نجاست جیسے اہم مسئلے میں دلیل بنانا درست نہیں ہے؟

(۱۴) مکروہ اوقات میں نماز کی قضا کرنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہؒ نے چار روایات نقل کی ہیں۔ ان میں سے ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم للذين ناموا معه حتى طلعت الشمس فقال انكم كنتم امواتا فرد الله اليكم اروا حكم فمن نام عن صلاة او نسي صلاة فليصلها اذا ذكرها واذا استيقظ.

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱ ص ۳۷۱)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے فرمایا جو (حالت سفر میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سو گئے تھے (وہ سوتے رہیں) یہاں تک کہ سورج نکل آیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم مردہ تھے (یعنی نیند کی حالت میں تھے) پھر اللہ تعالیٰ نے تمہاری روحوں کو تمہاری طرف لوٹا دیا (یعنی تمہیں جگا دیا) جو شخص سوتا رہا یا نماز پڑھنا بھول گیا تو اسے چاہیے کہ جس وقت اسے یاد آئے یا بیدار ہو جائے تو (قضاء) نماز پڑھ لے۔

اعتراض:

اس کے بعد ابن ابی شیبہ امام صاحب پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

ان ابا حنیفه قال: لا یجزئه ان یصلی اذا استیقظ عند طلوع الشمس او عند غروبها (ایضاً)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ سورج کے طلوع یا غروب ہونے کے وقت کوئی بیدار ہوا (یا اسے نماز یاد آ گئی) تو اس وقت نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ سورج کے طلوع یا غروب ہونے کے وقت اور سورج کے زوال کے وقت قضاء نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے دلائل وہ صحیح احادیث ہیں جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ۱:

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لا یتحری احد کم فیصلی عند طلوع الشمس ولا عند غروبها (مسلم جلد ۱ ص ۲۷۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی بھی سورج کے طلوع ہونے کے وقت اور غروب ہونے کے وقت نماز پڑھنے کا ارادہ نہ کرے۔

دلیل نمبر ۲:

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تحروا بصلاتکم طلوع الشمس ولا غروبها فانها تطلع بقرنی شیطان (مسلم جلد ۱ ص ۲۷۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سورج کے نکلنے کے وقت اور غروب ہونے کے وقت نماز پڑھنے کا ارادہ نہ کرو کیونکہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان نکلتا ہے۔

دلیل نمبر۳:

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا بدا حاجب الشمس فاخروا الصلوة حتی تبرز واذا غاب حاجب الشمس فاخروا الصلاة حتی تغیب
(مسلم جلد۱ص۲۷۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب سورج کا کنارہ ظاہر ہوں تو نماز کو اس وقت تک موخر کرو جب تک سورج مکمل طور ظاہر نہ ہو جائے اور جب سورج کا کنارہ غائب ہو جائے تو نماز کو اس وقت ایک موخر کرو جب تک سورج مکمل طور پر غروب نہ ہو جائے۔

دلیل نمبر۴:

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

ثلاث ساعات کان رسول الله صلی الله علیه وسلم ینهانا ان نصلی فیهن او ان نقبر فیهن موتانا حین تطلع الشمس بارغة حتی ترتفع حین یقوم قائم الظهیرة حتی تمیل الشمس وحین تضیف الشمس للغروب حتی تغرب (مسلم جلد۱ص۲۷۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں تین اوقات سے منع فرمایا کرتے تھے (کہ ان تین اوقات میں) ہم نماز پڑھیں یا ان میں ہم اپنے مردوں کو دفن کریں (ایک یہ کہ) جس وقت سورج طلوع ہو رہا ہو یہاں تک کہ بلند ہو جائے اور جب بالکل نصف النہار (زوال) کا وقت ہو یہاں تک کہ سورج ڈھل جائے اور جب سورج غروب ہونے کے لیے اتر رہا ہو یہاں تک کہ غروب سے ہو جائے۔

دلیل نمبر۵:

حضرت عبداللہ صنابحی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: الشمس تطلع ومعها قرن الشطان فاذا ارتفعت فارقها، فاذا استوت قارنها، فاذا زالت فارقها، فاذا دنت للغروب قارنها، فاذا غربت فارقها نهی رسول الله صلی الله علیه

وسلم عن الصلوة فی تلك الساعات (نسائی جلد ۱ ص ۹۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کے ساتھ شیطان کی سینگ ہوتی ہے۔ جب سورج بلند ہو جاتا ہے۔ تو وہ اس سے جدا ہو جاتا ہے جب سورج دو پہر کو سدھائی (یعنی زوال کے وقت) پر آجاتا ہے تو پھر اس سے مل جاتا ہے پھر جب سورج ڈھل جاتا ہے تو اس سے جدا ہو جاتا ہے جب سورج غروب ہونے کے قریب ہوتا ہے تو پھر اس سے مل جاتا ہے جب سورج ڈوب جاتا ہے تو اس سے جدا ہو جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان (تینوں) اوقات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔

دلیل نمبر ۶:

حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں:

یا رسول الله هل من ساعة اقرب من الاخری من ساعة اقرب او هل من ساعة یبتغی ذکر بها؟ قال: نعم اِن اقرب ما یکون الرب عز و جل من العبد جوف اللیل الآخر فان استطعت ان تکون ممن یذکر الله عز وجل فی تلك الساعة فكن: فان الصلوة محضورة مشهودة إلى طلوع الشمس فانها تطلع بین قرنی السلطان وهی ساعة صلاة الکفار فدع الصلوة حتی ترتفع قید رمح ویذهب شعاعها ثم الصلاة محضورة مشهودة حتی تعتدل الشمس اعتدال الرمح بنصف النهار، فانها ساعة تفتح فیها ابواب جهنم وتسجر فدع الصلاة حتی یفئی الفئی ثم الصلاة محضورة مشهودة حتی تغیب الشمس فانها تغیب بین قرنی الشیطان وهی صلاة الکفار (نسائی جلد ۱ ص ۹۶)

(میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا) اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا کوئی ایسا وقت ہے جس میں اللہ کا قرب زیادہ ہوتا ہے دوسرے وقتوں کی بنسبت یا کوئی ایسی گھڑی ہے جس میں اللہ کا ذکر مطلوب ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں اللہ تعالیٰ رات کے آخری حصہ میں بندوں سے زیادہ قریب ہوتا ہے اگر تم طاقت رکھتے ہو اس بات کی کہ تم اس وقت اللہ کو یاد کرنے والوں میں سے ہو تو ہو جاؤ کیونکہ نماز میں فرشتے حاضر ہوتے

ہیں سورج کے طلوع ہونے تک (رہتے ہیں پھر چلے جاتے ہیں) کیونکہ سورج شیطان کے دوسینگوں کے درمیان نکلتا ہے اور یہ کافروں کی نماز کا وقت ہے (اس وقت) تم نماز پڑھنا چھوڑ دو یہاں تک کہ سورج نیزہ کے برابر بلند ہو جائے اور اس کی کرنیں بھی ختم ہو جائے پھر (نوافل وغیرہ) نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں موجود رہتے ہیں یہاں تک کہ ٹھیک دوپہر کے وقت سورج نیزہ کی طرح سیدھا ہو جائے اس وقت میں جہنم کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور وہ بھڑکائی جاتی ہے تم (اس وقت بھی) نماز نہ پڑھو یہاں تک کہ سایہ لوٹنے لگے پھر (ظہر) کی نماز میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں موجود رہتے ہیں یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے بے شک سورج شیطان کے دوسینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور یہ کافروں کی نماز کا وقت ہے۔

ان روایات میں طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور نصف النہار (زوال) کے وقت مطلقاً ہر قسم کی نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، جس میں ہر قسم کی نماز داخل ہے حتیٰ کہ وہ فوت شدہ نماز بھی ان اوقات میں داخل ہے۔

ان روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب احادیث کے موافق ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

ان روایات سے یہ مراد نہیں ہے کہ جس وقت نماز یاد آجائے یا وہ بیدار ہو تو اسی وقت نماز قضا کرے اگرچہ اوقات مکروہ ہی کیوں نہ ہو، بلکہ ان روایات کا مطلب یہ ہے جس وقت بیدار ہو یا یاد آجائے تو نماز فوراً ادا کرے لیکن مکروہ اوقات کے علاوہ وقت میں کیونکہ ان تین اوقات مکروہ طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور نصف النہار (زوال) کے وقت صحیح اور صریح روایات میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔

یعنی یہ تین اوقات مکروہ مستثنیٰ ہیں ان کے علاوہ جس وقت بھی بیدار ہو یا نماز یاد آجائے تو نماز قضا کرے اور ان اوقات کا مستثنیٰ ہونا خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان فی سفر لہ فمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملت معہ فقال: انظر فقلت ھذا راکب ھذان راکبان ھؤلاء ثلاثہ حتی صرنا سبعۃ فقال: احفظوا علینا صلاتنا یعنی صلاۃ الفجر فضرب علی اذانھم فما ایقظھم الا حر الشمس فقاموا فساروا ھنیۃ ثم نزلوا فتوضوا واذن بلال فصلوا رکعتی الفجر ثم صلو الفجر ورکبوا فقال بعضم لبعض قد فرطنا فی صلاتنا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ لا تفریط فی النوم انما التفریط فی الیقظہ فاذا سھا احدکم من صلاۃ فلیصلھا حین یذکرھا ومن الغد للوقت (ابوداؤد جلد ۱ ص ۶۳ مکتبہ اقرا قرآن اکیڈمی)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف مڑے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مڑ گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دیکھو (کون آ رہے ہیں) میں نے کہا یہ ایک سوار ہے یہ دو سوار ہیں یہ تین ہیں یہاں تک کہ ہم سات ہو گئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ہماری نماز کا خیال رکھنا یعنی نماز فجر کا لیکن انہیں نیند آ گئی انہیں سورج کی تپش نے بیدار کیا تو لوگ اٹھے اور تھوڑی دور چلے پھر سواری سے اترے اور وضو کیا بلالؓ نے اذان دی تو سب سے پہلے فجر کی دو سنتیں پڑھیں پھر فجر کی نماز ادا کی اور سوار ہو کر آپس میں کہنے لگے ہم نے اپنی نماز میں کوتاہی کی تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کی حالت میں کوئی کوتاہی نہیں کوتاہی جاگنے کی حالت میں ہے لہٰذا جب کوئی تم میں سے نماز (پڑھنا) بھول جاتے تو جس وقت یاد آئے پڑھ لے اور دوسرے دن اپنے اپنے وقت پر پڑھے۔

اس روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے جاگنے کے فوراً بعد نماز نہیں پڑھی بلکہ تھوڑی دور جا کر نماز ادا کی۔

اور ابوداؤد میں ہی اس سے اگلی روایت میں تو واضح طور پر موجود ہے کہ صحابہ کرام اٹھتے ہی فوراً نماز ادا کرنے لگے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت ادا کرنے سے منع فرمادیا۔

چنانچہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فقمنا و هلين لصلاتنا افعال النبی صلى الله عليه وسلم رويداً رويداً حتی تعالت الشمس قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من كان منكم يركع ركعتی الفجر فلير كعهما (الی اخره) (ابوداؤد جلد ا ص ٦٣)

ہم گھبرائے ہوئے اپنی نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھہرو، ٹھہرو یہاں تک کہ سورج چڑھ آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جو فجر کی دو دو رکعت پڑھتا ہے وہ پڑھ لے (الی آخرہ)

اس روایت میں صاف طور پر موجود ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طلوع آفتاب کے وقت صحابہ کرام کو نماز پڑھنے سے منع فرمایا جب سورج مکمل طلوع ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے نماز قضا کی اور آخر میں وہی حدیث ارشاد فرمائی جو ابن ابی شیبہ نے نقل کی ہے۔

اس واقعہ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جن احادیث میں ہے کہ "جب تم بیدار ہو یا نماز یاد آ جائے تم تو قضا کر لو" ان سے یہ تین اوقات طلوع آفتاب، غروب آفتاب اور نصف النہار (زوال) مستثنیٰ ہیں یعنی ان اوقات کے علاوہ نماز کی قضاء کر سکتے ہیں۔

(۱۵) سر پر بندھے کپڑے اور پگڑی پر مسح کرنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہؒ نے تین روایات نقل کی ہیں۔

ان میں سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم مسح على الخفين والخمار

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۱)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں اور (سر پر باندھے ہوئے) کپڑے پر مسح فرمایا۔

اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

عن النبی صلی الله علیه وسلم انه مسح مقدم راسه علی الخفین و وضع یده علی العمامة ومسح علی العمامة (ص۳۷۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سر کے اگلے حصہ کا اور موزوں پر مسح فرمایا اور اپنا ہاتھ، عمامہ پر رکھا اور عمامہ پر مسح فرمایا۔

اس کے بعد ابن ابی شیبہ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان ابا حنیفه قال: لا یجزئی المسح علیهما. (ایضاً)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ پگڑی اور اوڑھنی (سر پر بندھے ہوئے کپڑے) پر مسح کرنا جائز نہیں ہے۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ عمامہ (پگڑی) پر اور اوڑھنی (سر پر کوئی کپڑا بندھا ہوا ہو) پر مسح کرنا درست نہیں ہے بلکہ سر پر مسح کرنے سے فرض ادا ہوگا۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں

وبهدا نأخذ لا یمسح علی الخمار ولا العمامة (الی ان قال) وهو قول ابی حنیفه والعآمة من فقهائنا (موطا امام محمد ص۷۱)

ہم اسی بات کو اختیار کرتے ہیں پگڑی اوڑھنی پر مسح نہ کیا جائے (آگے مزید فرماتے ہیں) یہی امام ابوحنیفہؒ اور ہمارے دیگر فقہاء کا قول ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے اس مسلک پر قرآن کریم کی آیت کریمہ قولی اور فعلی احادیث ہیں جن میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا مسح فرمایا ہے اور صحابہ کرام کے آثار بھی موجود ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ۱:

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْآ اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰاةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ

اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُؤُسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ (المائدة:٦)

اے ایمان والوں جب تم نماز کے لئے اٹھوتو اپنے چہرے، اور کہنیوں تک اپنے ہاتھ دھو لو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں (بھی) ٹخنوں تک (دھولیا کرو)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے سر کے مسح کا حکم ارشاد فرمایا ہے لہٰذا سر پر مسح کرنا فرض ہے (اور اس کی مقدار امام ابوحنیفہ کے نزدیک سر کا چوتھا حصہ ہے) پگڑی یا اوڑھنی پر مسح کرنے کو سر پر مسح کرنا نہیں کہتے اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ کے نزدیک محض عمامہ (پگڑی) یا اوڑھنی پر مسح کرنے سے فرض مسح ادا نہیں ہوگا امام ابوحنیفہ کے نزدیک مسح کی فرض مقدار وہ سر کا چوتھائی حصہ ہے۔

دلیل نمبر۲:

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مسح علی الخفین و مقدم رأسه وعلی عمامته (مسلم جلد اص ۱۳۴، حدیث نمبر ۶۳۴)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر اور سر کے اگلے حصہ پر اور پگڑی پر مسح کیا۔

دلیل نمبر۳:

حضرت عطاء ابن رباحؒ سے مروی ہے

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توضأ فرفع العمامة فمسح مقدم رأسه (مصنف ابن ابی شیبہ جلد اص ۳۶، حدیث نمبر ۲۸۷)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو اپنا عمامہ اتارا اور اپنے سر کے اگلے حصہ کا مسح فرمایا۔

دلیل نمبر۴:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

رایت النبی صلی الله علیه وسلم توضا فمسح رأسه مسحة

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱ ص ۲۶، حدیث نمبر ۱۳۳)

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا انہوں نے وضو فرمایا اور ایک مرتبہ اپنے سر کا مسح کیا۔

دلیل نمبر ۵:

حضرت ابو علقمہؒ سے مروی ہے کہ

ان عثمان دعا بماء فتوضا فافرغ بیده الیمنی علی الیسری ثم غسلها الی الکوعین قال: ثم مضمض واستنشق ثلاثا وذکر الوضوء ثلاثا قال و مسح براسه ثم غسل رجلیه، وقال رایت رسول الله صلی الله علیه وسلم توضأ مثل ما رائیتمونی توضات (ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵، حدیث نمبر ۱۰۹)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پانی منگوایا اور وضو کیا (پہلے) دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈالا پھر دونوں ہاتھوں کو کلائیوں تک دھویا پھر تین بار کلی کی اور تین بار ناک میں پانی ڈالا پھر (راوی نے) کہا کہ (عثمان نے) اپنے سر کا مسح کیا پھر دونوں پاؤں دھوئے اور فرمایا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے جیسے تم نے مجھے وضو کرتے دیکھا ہے۔

دلیل نمبر ۶:

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رایت رسول الله صلی الله علیه وسلم وعلیه عمامة قطریه فادخل یده من تحت العمامة فمسح مقدم رأسه ولم ینقض العمامة

(ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۹، حدیث نمبر ۱۴۷، سنن الکبری بیہقی جلد ۱ حدیث نمبر ۲۸۰)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے دیکھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر قطری عمامہ تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ پگڑی کے نیچے داخل کیا اور پگڑی کھولے بغیر اپنے سر کے اگلے حصہ کا مسح فرمایا۔

دلیل نمبر ۷:

حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم مسح علی الخفین وناصیۃ والعمامۃ

(سنن الکبری بیہقی جلد ا، حدیث نمبر ۲۸۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پیشانی (کے بالوں) اور پگڑی پر مسح کیا۔

دلیل نمبر ۸:

ابولبیدؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں

رایت علیا اتی الغیط علی بغلہ لہ وعلیہ ازار ورداء وعمامۃ وخفان فرایتہ بال ثم توضا فحسر العمامہ فرایت راسہ مثل را جتی علیہ مثل خط الاصابع من الشعر فمسح براسہ ثم مسح علی خفیہ

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۲ ص ۱۳۵، حدیث نمبر ۲۳۶)

میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ اپنے خچر پر سوار ہو کر قضاء حاجت کے لئے آئے اور آپ نے اور اس وقت ازار، چادر عمامہ (پگڑی) اور دو موزے پہن رکھے تھے، آپ نے پیشاب کیا پھر وضو فرمایا آپ نے عمامہ اتار دیا میں نے دیکھا کہ آپ کا سر میری ہتھیلی کی مانند ہے اس پر انگلی کی لکیر کی مانند بال ہیں آپ نے اپنے سر کا مسح فرمایا پھر موزوں کا مسح کیا۔

دلیل نمبر ۹:

حضرت نافعؒ سے مروی ہے:

عن ابن عمر: انہ کان اذا مسح رأسہ رفع القلنسوۃ ومسح مقدم راسہ

(سنن دارقطنی جلد ا ص ۲۷۰ مکتبہ المعرفہ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب اپنے سر کا مسح فرماتے تو اپنی ٹوپی اٹھاتے اور اپنے سر کے اگلے حصہ پر مسح فرماتے۔

دلیل نمبر ۱۰:

حضرت نافع ؒ سے مروی ہے

عن ابن عمر انه کان لا یمسح علی العمامة

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱ ص ۳۶، حدیث نمبر ۲۳۴)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ عمامہ (پگڑی) پر مسح نہیں کرتے تھے۔

دلیل نمبر ۱۱:

ابوعبیدہ بن محمد بن عمار بن یاسر سے مروی ہے فرماتے ہیں

سالت جابراً عن المسح علی العمامة فقال امس الماء الشعر

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱ ص ۳۶، حدیث نمبر ۲۳۲)

میں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے عمامہ (پگڑی) پر مسح کرنے کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا بالوں کو بھی پانی لگاؤ۔

دلیل نمبر ۱۲:

امام مالک ؒ نقل فرماتے ہیں کہ

ان جابر بن عبدالله انصاری سئل عن المسح علی العمامة فقال لاحتی یمسح الشعر بالماء (موطا امام مالک ص ۲۳ حدیث نمبر ۶۱)

حضرت جابر بن عبداللہ سے عمامہ (پگڑی) پر مسح کرنے کے متعلق پوچھا گیا (کہ کیا پگڑی پر مسح کر سکتے ہیں؟) آپ نے فرمایا نہیں یہاں کیا کہ پانی بالوں کو لگ جائے۔

دلیل نمبر ۱۳:

حضرت مغیرہ فرماتے ہیں:

کان اذا کانت علی ابراهیم عمامة او قلنسوة رفعها ثم مسح علی یافوخه (مصنف ابن ابی شبہ جلد ۱ ص ۳۶، حدیث نمبر ۲۳۵)

جب حضرت ابراہیم نخعی نے پگڑی یا ٹوپی پہنی ہوتی تو وضو کرتے وقت ان دونوں کو اتار دیتے پھر اپنے سر کا مسح کرتے تھے۔

دلیل نمبر۱۴:

حضرت ابوالبختریؒ فرماتے ہیں:

رایت الشعبی توضا فحسر العمامة.

(ابن ابی شبہ جلد اص ۳۶، حدیث نمبر ۲۳۶)

میں نے امام شعبی کو دیکھا کہ وہ وضو کرتے وقت اپنے عمامہ (پگڑی) کو اتار دیتے (اور بر سر کا مسح کرتے)

دلیل نمبر۱۵:

حضرت ہشام نے والد سے عروہ بن زبیر کے بارے میں نقل کرتے ہیں

انه کان ینزع العمامة ویمسح رأسه بالماء

(موطا امام مالک، ص ۲۳، ابن ابی شبہ جلد اص ۳۶، حدیث نمبر ۲۳۷)

وہ وضو کرتے وقت عمامہ (پگڑی) اتار دیتے تھے اور اپنے سر کا مسح پانی سے کرتے تھے۔

قارئین کرام! ان تمام احادیث وآثار سے یہ بات بخوبی واضح ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مسئلہ دلیل کی بنیاد پر ہے اور حدیث کے موافق ہے۔

ابن ابی شیبہ نے جو روایات نقل کی ہے اس کے مختلف جوابات ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

جواب مبرا:

یہ روایت امام صاحب کے نزدیک منسوخ ہے

چنانچہ امام محمد فرماتے ہیں

ان المسح علی العمامة کان فترك وهو قول ابی حنیفة والعامة من فقهائنا (موطا امام محمد ص ۷۱)

ابتداء میں عمامہ (پگڑی) پر مسح کرنا جائز تھا پھر ترک کر دیا گیا اور یہی امام ابوحنیفہ اور ہمارے دیگر فقہاء کا قول ہے۔

جواب نمبر۲:

ہمارے نزدیک یہ روایت مجمل ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ دوسری تفصیلی روایات میں موجود ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمامہ (پگڑی) پر مسح مقدار ناصیہ کے بعد کیا جس سے فرض مسح ادا ہو گیا اگر محض پگڑی پر مسح کرنے سے مسح ہو جاتا ہے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سر کے اگلے حصہ یعنی پیشانی پر مسح نہ فرماتے حالانکہ مسلم، اور بیہقی کی روایات گزر چکی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مقدار ناصیہ کا مسح فرمایا پھر پگڑی کا مسح کیا جو اس بات پر دال ہے کہ محض عمامہ پر مسح کرنا درست نہیں ہے۔

جواب نمبر۳:

حضرت شیخ الہند اس حدیث کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

یمکن ان یکون خطأ الراوی بان زعم تسویة العامة مسح العمامة۔

(تقریر ترمذی لشیخ الہند ص ۸)

ممکن ہے کہ راوی کی خطا ہو اس وجہ سے کہ (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسح ناصیہ کے بعد) اپنے عمامہ کو درست کیا اور راوی نے اس کو مسح عمامہ سمجھا۔

جواب نمبر۴:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سر کے اگلے حصہ مقدار ناصیہ پر مسح فرمایا اور فرض ادا کیا پھر بطور استیعاب کے عمامہ پر مسح فرمایا اور مسح کی یہ صورت امام ابو حنیفہ کے نزدیک جائز ہے۔

(۱۶) قعدہ اخیرہ میں بیٹھے بغیر زائد رکعت پڑھنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہؒ نے دو روایات نقل کی ہیں جن میں سے دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی الظهر خمسا فقیل له انك صلیت خمسًا فسجد سجدتین بعد ما سلم (مصنف ابن ابی شیبہ جلد۸ ص ۲۷۲)

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (بھول کر) ظہر کی نماز پانچ رکعت پڑھادی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ رکعات پڑھی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے بعد دوسجدے (سہو) کیے۔

ان روایات کونقل کرنے کے بعد حافظ صاحبؒ امام ابوحنیفہؒ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ان ابا حنيفة قال: اذام لم يجلس فى الرابعة اعاد الصلاة (ايضًا)

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جب چوتھی رکعت میں قعدہ میں نہ بیٹھے اور زائد رکعت پڑھ لی) تو وہ نماز کا اعادہ کرے۔ (دوبارہ لوٹائے)

جواب:

اس مسئلہ میں امت کا اجماع ہے کہ نماز کا آخری قعدہ فرض ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ فرض کے ترک کردینے سے نماز میں نہیں ہوتی اسی وجہ سے امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ چوتھی رکعت کے قعدہ میں بیٹھے بغیر اگر کوئی شخص پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہوا تو اس کی نماز درست نہیں ہے کیونکہ آخری قعدہ فرض ہے اور فرض کے ترک کرنے سے نماز نہیں ہوتی ہے۔ اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے مسلک کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص چار رکعت والی نماز کے قعدہ اخیرہ میں بیٹھے بغیر پانچویں رکعت کے لیے کھڑا ہو گیا ہے تو جب تک پانچویں رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو تو نمازی کو چاہیے کے واپس لوٹ آئے اور قعدہ اخیرہ کر کے سجدہ سہو کرلے اور اگر اس نے پانچویں رکعت کا سجدہ کرلیا ہے تو نماز اس کی باطل ہو جائے گی اس وجہ سے کہ اس نے فرض کے ارکان کو مکمل کیے بغیر نفل شروع کرلیا ہے۔ اور اگر چوتھی رکعت کا قعدہ کرنے کے بعد پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا ہو تو پانچویں رکعت کا سجدہ کرنے سے پہلے پہلے لوٹ آئے اور سجدہ سہو کر کے نماز مکمل کرے اور اگر پانچویں رکعت کا سجدہ کرلیا اور ایک رکعت اس نے مکمل کر لی تو اس صورت میں اس کو چاہیے کہ چھٹی رکعت ساتھ ملالے اور آخر میں سجدہ سہو کر کے نماز مکمل کرلے تاکہ آخری دو رکعت نفل ہو جائے اور چار رکعت فرض ادا ہو جائے۔ چنانچہ صاحب ہدایہ امام برہان الدین المرغینانی الحنفی (التوفی

۵۹۳ھ) تحریر فرماتے ہیں:

وان سها عن القعدة الاخيره حتى قام الى الخامسة رجع الى القعدة مالم يسجد، لان فيه اصلاح صلاته و امكنه ذلك لان مادون الركعة بمحل الرفض وقال والغى الخامسة لانه رجع الى شيء محله قبلها فيفترض، وسجد للسهو لانه اخر واجبا وان قيد الخامسة بسجدة بطل فرضه عندنا لانه استحكم شروعه فى النافلة قبل اكمال اركان المكتوبه ومن ضرورته خروجه عن الفرض (هدایہ جلد اص ۱۶۶ مکتبہ المیزان)

اور اگر نمازی قعدہ اخیرہ بھول گیا یہاں تک کہ پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا تو اگر (پانچویں رکعت کا) سجدہ نہ کیا ہو تو قعدہ کی طرف لوٹ آئے کیونکہ اس میں اس کی نماز کی اصلاح ہے اور نمازی کے لئے ایسا کرنا ممکن بھی ہے اس لیے کہ ایک رکعت سے کم محل رفض میں ہے اور پانچویں رکعت کو توڑ دے کیونکہ وہ ایسی چیز کی طرف لوٹا ہے کہ اس کا محل اس (پانچویں رکعت) سے پہلے ہے پس وہ فرض ہے اور سجد سہو کرے اس لیے کہ اس نے واجب کو موخر کر دیا ہے اور اگر پانچویں رکعت کا سجدہ کرلیا ہے تو ہمارے نزدیک اس کا فرض باطل ہو گیا ہے اس لئے کہ فرض کے ارکان کو مکمل کرنے سے پہلے اس کا نفل کو شروع کرنا مستحکم ہو گیا حالانکہ اس کا فرض سے نکلنا ضروری تھا۔

صاحب ہدایہ کی ان تمام عبارات سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک پانچویں رکعت پڑھنے سے مطلقاً نماز باطل نہیں ہوئی بلکہ اُس صورت میں نماز درست نہیں ہے کہ نمازی قعدہ اخیرہ ترک کر کے پانچویں رکعت پڑھے کیونکہ قعدہ اخیرہ فرض ہے۔ اور فرض کے ترک سے نماز فاسد ہو جاتی ہے ہاں اگر قعدہ اخیرہ ادا کرنے کے بعد پانچویں رکعت شروع کی تو پھر فرض کے مکمل ہونے کی وجہ سے نماز درست ہو گی جیسا کہ گزر چکا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ کا مسلک کسی حدیث کے خلاف نہیں ہے اور فقہی نقطہ نظر سے امام ابوحنیفہ کے مسلک پر کوئی اعتراض واقع نہیں ہوتا۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

ان روایات سے امام ابوحنیفہ پر اعتراض وارد نہیں ہوتا کیونکہ یہ روایات امام ابوحنیفہ کے مسلک کے خلاف نہیں ہے اعتراض تو تب ہوتا جب ان روایات میں اس بات کا ذکر ہوتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچویں رکعت چوتھی رکعت کے قعدہ کیے بغیر پڑھی حالانکہ ان روایات میں اس بات کا سرے سے ذکر ہی نہیں۔ ہاں حدیث کے ظاہر سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری قعدہ کیا اور اس کے بعد بھولے سے پانچویں رکعت کے لئے کھڑے ہوئے اور آخر میں سجدہ سہو فرمایا اور اس صورت میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی سجدہ سہو کے ساتھ نماز درست ہے جیسا کہ گزر چکا ہے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قعدہ اخیرہ کیا اور پھر پانچویں رکعت کے لیے کھڑے ہوئے اس کی دلیل یہ ہے کہ جب صحابی نے کہا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا نماز میں زیادتی ہوگئی ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی پانچ رکعتیں ادا کی ہیں۔ یہ الفاظ اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قعدہ اخیرہ کیا تھا کیونکہ نماز ظہر نام ہے تمام ارکان کا، قیام، قرأۃ، رکوع، سجود، قومہ، جلسہ، اور قعدہ اخیرہ کا نہ کے بغیر قعدہ اخیرہ کا۔

چنانچہ امام بدرالدین عینی الحنفی (المتوفی ۸۵۵ھ) رقم فرماتے ہیں:

وتأويل الحديث انه صلى الله عليه وسلم قعد على الرابعة بدليل انه قال صلى الظهر خمسا والظهر اسم لجميع الاركان ومنها القعدة.

(البنايه شرح الهدايه جلد۲ ص۶۱۹ مكتبه دار الكتب)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھی رکعت کا قعدہ فرمایا تھا اس کی دلیل یہ ہے کہ صحابی نے فرمایا "**صلی الظهر خمسا**" (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی پانچ رکعت پڑھی) اور ظہر نام ہے جمیع ارکان کا اور ان (ارکان) میں سے قعدہ اخیر بھی ہے۔

علامہ عینی کی اس عبارت سے واضح ہوتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چوتھی رکعت کا قعدہ کیا تھا پھر غلطی سے پانچویں رکعت کے لئے کھڑے ہوئے اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اخری قعدہ کیے بغیر کھڑے ہوتے تو صحابی یہ لفظ " **صلی الظهر خمسا**" استعمال نہ

فرماتے۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مسئلہ حدیث کے خلاف نہیں بلکہ حدیث کے موافق ہی ہے۔

(۱۷) حالت احرام میں شلوار یا جوتے پہننا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے تین روایات نقل کی ہیں۔ان میں سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں.

سمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقول: اذا لم یجد المحرم ازارا فلیلبس سراویل واذا لم یجد نعلین فلیلبس خفین

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۲)

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا کہ اگر محرم کو پہننے کے لئے ازار (چادر/لنگی) نہ ملے تو وہ شلوار پہن لے اور اگر پہننے کے لئے جوتے نہ ملے تو موزے پہن لے۔

اس کے بعد ابن ابی شیبہ امام صاحب پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

ان ابا حنیفة قال: لا یفعل فان فعل فعلیه دم. (ایضاً)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ وہ ایسا نہ کرے اگر اس نے ایسا کیا (شلوار یا موزے پہنے) تو اس پر دم (قربانی) واجب ہوگی۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ حالت احرام میں محرم کے لیے جو چیزیں ممنوع ہیں اگر انہیں استعمال کیا جائے تو دم لازم آئے گا اگرچہ عذر کی وجہ سے کرنے کی اجازت تو گی (جیسا کہ ابن ابی شیبہ کی نقل کردہ روایت میں عذر کے وقت شلوار اور موزے پہننے کی اجازت دی گئی ہے) لیکن دم ساقط نہ ہوگا۔امام ابوحنیفہ کا یہ موقف دلائل کی بنیاد پر ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ا:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ (البقرہ:۱۹۶)

اور اپنے سر اس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ ہاں اگر تم میں سے کوئی شخص بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو تو وہ روزوں یا صدقے یا قربانی کا فدیہ دے۔

قارئین کرام! اس آیت کریمہ میں غور فرمائیں کہ قربانی سے پہلے محرم کے لئے بال کٹوانا ممنوع ہے لیکن عذر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اجازت تو دے دی لیکن دم کو ساقط نہ فرمایا۔ یہی بات امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جو کام محرم کے لیے منع ہے۔ اگر اس کام کو عذر کی وجہ سے کرے گا اگرچہ کرنا جائز تو ہوگا لیکن دم ضرور لازم آئے گا۔ اسی طرح زیر بحث مسئلہ میں امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ضرورت اور مجبوری کے وقت موزے یا شلوار پہننا جائز تو ہوگا لیکن ایسا کرنے کی وجہ سے دم بھی لازم ہوگا۔

دلیل نمبر۲:

حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

اتى على رسول الله صلى الله عليه وسلم زمن الحديبية وانا اوقد تحت القوارير قدر لى وقال ابو الربيع برمة لى والقمل يتناثر على وجهى فقال ايوذيك هوام راسك قال قلت نعم قال فاحلق وصم ثلثة ايام او اطعم ستة مساكين او انسك نسيكة (مسلم جلد ا ص ۳۸۲، حدیث نمبر ۲۸۷۷)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ والے سال میرے پاس تشریف لائے اور میں ہانڈی کے نیچے آگ جلا رہا تھا اور میرے چہرے پر جوئیں گر رہی تھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا جوئیں تجھے تکلیف دے رہی ہیں میں نے کہا ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو

اپنا سر منڈا دے اور تین دن کے روزے رکھ لے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا یا ایک قربانی کر،

اس صحیح روایت میں یہ بات واضح طور پر موجود کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محرم کو حالت احرام میں مجبوری اور تکلیف کی وجہ سے سر مونڈنے کی اجازت تو دے دی لیکن فدیہ (دم) کو ساقط نہ فرمایا۔

ان دونوں دلیلوں سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو رہی ہے کہ جو چیز حالت احرام میں ممنوع ہے اگر کسی تکلیف یا عذر کی وجہ سے اسے اختیار کیا جائے تو جائز تو ہوگا لیکن انہیں اختیار کرنے کی وجہ سے دم (فدیہ) دینا ہوگا۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

ان روایات سے امام ابوحنیفہ پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ بھی عذر اور تکلیف کے وقت شلوار ہو یا موزے پہننے کو جائز سمجھتے ہیں اختلاف اس بات پر ہے کہ اگر کسی نے عذر کی وجہ سے موزے یا شلوار پہن لیے کیا اس پر کفارہ لازم ہوگا یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ (دم) کفارہ کو دوسرے دلائل کی بنیاد پر لازم سمجھتے ہیں جبکہ یہ مذکورہ حدیث کفارہ کے واجب ہونے کی نفی سے خاموش ہیں اس میں کفارہ کے ہونے نہ ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ امام طحاویؒ فرماتے ہیں۔

اما ما ذكرتموه من لبس المحرم الخف والسراويل على الضرورة فنحن نقول بذالك نبيح له لبس للضرورة التي هي به ولكنا نوجب عليه مع ذلك الكفارة وليس فيما رويتموه نفي لوجوب الكفارة ولا فيه ولا في قولنا خلاف لشيء من ذلك لانا لم نقل لا يلبس الخفين اذا لم يجد نعلين ولا السراويل اذا لم يجد ازارا و لو قلنا ذلك كنا مخالفين لهذا الحديث و لكنا قد ابحنا له اللباس كما اباح له النبي صلى الله عليه وسلم ثم اوجبنا عليه مع ذلك الكفارة بالدلائل القائمة الموجبة لذلك.

(طحاوی جلد ا ص ۳۶۷، مکتبہ رحمانیہ)

جوتم نے محرم (احرام پہنے والے) کی ضرورت کے وقت موزے اور شلوار پہننے کا ذکر کیا ہے تو ہم بھی یہی کہتے ہیں (یعنی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں) ہم (بھی) ضرورت کے وقت محرم کے لیے (موزے شلوار) کا پہنا جائز سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم کفارہ (دم) کو بھی اس (محرم) پر واجب کہتے ہیں اور جو روایت تم نے پیش کی ہے اس میں کفارہ کے واجب ہونے کی نفی نہیں ہے اور اس روایت اور ہمارے قول میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے کیونکہ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ازار اور جوتے نہ ملنے کی صورت میں موزے اور شلوار نہ پہنے۔ اگر ہم یہ بات کہتے تو ہماری بات اس حدیث کے مخالف ہوتی لیکن ہم نے اس (معذور محرم) کے لیے اس لباس کو جائز قرار دیا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا ہے۔ پھر دیگر مضبوط دلائل کی وجہ سے (جو امام صاحب کے دلائل کے ضمن میں گزر چکے ہیں) اس پر کفارہ (دم) کو لازم قرار دیا ہے۔

قارئین کرام! اس تفصیلی گفتگو سے یہ بات واضح ہوئی کہ امام ابوحنیفہ کا مسئلہ حدیث کے مخالف نہیں ہے۔

(۱۸) دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے چھ روایات نقل کی ہیں جن میں سے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں

ان النبی صلی الله علیه وسلم جمع بین الظهر والعصر وبین المغرب والعشاء فی السفر فی غزوة تبوك (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک میں کے سفر میں ظہر کی نماز عصر کے ساتھ اور مغرب کی نماز عشاء کے ساتھ جمع کر کے پڑھا۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد ابن ابی شیبہ امام ابوحنیفہ پر اعتراض کرتے ہوئے نقل فرماتے ہیں:

ان ابا حنیفة قال: لا یجزئه ان یفعل ذلك (ایضًا)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ دو نمازوں کو جمع کرنا جائز نہیں ہے۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ حج کے دنوں میں عرفات اور مزدلفہ کے علاوہ دونمازوں کوایک وقت میں جمع کر کے پڑھنا جائز نہیں ہے۔

قال ابو حنیفه لا یجوز الجمع بین الصلوتین بسبب السفر ولا المطر ولا لمرض ولا غیرها الا بین الظهر والعصر بعرفات بسبب النسك وبین المغرب و العشاء بمزدلفة بسبب النسك. (شرح مسلم للنووی جلد اص ۲۴۵)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ دونمازوں کو (ایک وقت میں) سفر، بارش، بیماری اور اُن کے علاوہ کسی اور وجہ سے جمع کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں ظہر اور عصر کی نماز عرفات میں مغرب اور عشاء کی نماز مزدلفہ میں مناسک (حج) کی وجہ سے جمع کرنا جائز ہے۔

امام صاحبؒ کے اس موقف پر بہت سے دلائل ہیں، ملاحظہ فرمائیں۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ا:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا (سورہ النساء آیت نمبر ۱۰۳)

بے شک نماز مسلمانوں کے ذمے ایک ایسا فریضہ ہے جو وقت کا پابند ہے۔

دلیل نمبر ۲:

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

قال ما رایت النبی صلی الله علیه وسلم صلی صلوة لغیر میقاتها الا صلاتین جمع بین المغرب والعشاء و صلی الفجر قبل میقاتها

(بخاری جلد اص ۲۲۸ حدیث نمبر ۱۶۸۲)

فرماتے ہیں میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سوائے دونمازوں کے کسی نماز کو اس کے وقت کے بغیر پڑھتے نہیں دیکھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب اور عشاء ایک ساتھ

(مزدلفہ) میں پڑھی اور اس دن فجر کی نماز (بھی) (مزدلفہ میں) معمول کے وقت سے پہلے پڑھی۔

دلیل نمبر۳:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم كيف انت اذا كانت عليك امراء يوخرون الصلوة عن وقتها او يميتون الصلوة عن وقتها قال قلت فما تامرني قال صل الصلوة لوقتها فان ادركتها معهم فصل فانها لك نافلة.

(مسلم جلد۱ص۲۳۰، حدیث نمبر۱۴۶۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ تمہاری کیا حالت ہوگی (یعنی تم اس وقت کیا کروگے) جب تم پر ایسے حکمران ہوں گے جو نمازوں کو اس کے وقت سے تاخیر کر کے پڑھیں گے یا نماز کو اس کے وقت سے ختم کردیں گے تو میں نے عرض کیا کہ اس وقت میرے لئے کیا حکم ہوگا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا اور اگر ان (حکمران) کے ساتھ بھی (نماز) پالو تو پڑھ لینا وہ نماز تمہارے لئے نفل ہو جائے گی۔

دلیل نمبر۴:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

عن النبي صلى الله عليه وسلم انه قال وقت الظهر ما لم تحضر العصر ووقت العصر ما لم تصفر الشمس ووقت المغرب ما لم يسقط فور الشفق ووقت العشاء الى نصف الليل ووقت صلاة الفجر ما لم تطلع الشمس.

(ابوداؤد جلد۱ص۵۹، حدیث نمبر۳۹۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ظہر کا وقت اس وقت تک ہے جب تک عصر کا وقت داخل نہ ہو جائے۔ عصر کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج زرد نہ ہو جائے اور مغرب کا وقت اس وقت تک ہے جب شفق کی سرخی ختم نہ ہو جائے اور عشاء کا وقت آدھی رات تک ہے اور فجر کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج طلوع نہ ہو جائے۔

دلیل نمبر ۵:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں

سألت النبی صلی اللہ علیہ وسلم ای العمل احب الی اللہ قال الصلوۃ علی وقتھا قال ثم ای قال ثم بر الوالدین قال ثم ای قال الجہاد فی سبیل اللہ (بخاری جلد ۱ ص ۷۶، حدیث نمبر ۵۲۷)

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اللہ تعالی کے نزدیک کون سا عمل زیادہ پسندیدہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وقت پر نماز پڑھنا پھر پوچھا کہ اس کے بعد تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا پھر فرمایا اس کے بعد تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔

یہ روایت بخاری کے علاوہ سنن النسائی جلد ۱ ص ۱۰۰ حدیث نمبر ۶۱۱، مسند احمد حدیث نمبر ۳۷۷۶، کنز العمال حدیث ۱۸۸۹۷، مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱ ص ۳۵۰ وغیرہ میں بھی موجود ہے۔

دلیل نمبر ۶:

حضرت عبداللہ بن صامت سے مروی ہے کہ

عن ابی ذر قال کیف انتم او قال کیف انت اذا بقیت فی قوم یوخرون الصلوۃ عن وقتھا فصل الصلوۃ لوقتھا (الی اخرہ)

(مسلم جلد ۱ ص ۲۳۱، حدیث نمبر ۱۴۷۰)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہارا کیا حال ہوگا یا فرمایا تیرا کیا حال ہوگا (اس وقت) جب تو ایسی قوم (لوگوں) میں باقی رہ جائے گا جو نماز کو اپنے وقت سے موخر کر کے پڑھیں گے پس تو نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا۔

دلیل نمبر ۷:

حضرت عثمان بن وہب فرماتے ہیں:

سمعت ابا هريره يسأل ما التفريط فی الصلوٰة قال ان توخرها حق يدخل وقت التی بعدها. (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ا ص ۳۶۹ حدیث نمبر ۳۳۸۹)

میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو سنا ان سے پوچھا گیا کہ نماز میں تفریط کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ نماز کو اتنا مؤخر کرنا کے دوسری نماز کا وقت داخل ہو جائے۔

دلیل نمبر ۸:

حضرت منذر فرماتے ہیں:

سالت مرة ابا رزين متى تفوتنى صلاة فقال لاتفوتك صلاة حتى يدخل وقت الاخرى ولكن بين ذلك افراط و اضاعة

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ا ص ۳۶۸ حدیث نمبر ۳۳۸۷)

میں نے ایک مرتبہ ابورزین سے سوال کیا کہ میری نماز کب فوت ہوتی ہے، تو انہوں نے فرمایا تمہاری نماز اس وقت تک فوت نہیں ہوتی جب تک دوسری نماز کا وقت داخل نہ ہو جائے لیکن نماز میں تاخیر کرنا افراط اور نقصان دہ (نماز کو ضائع کرنا) ہے۔

دلیل نمبر ۹:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

انه كتب فی الافاق ينهاهم ان يجمعوا بين الصلاتين يخبرهم ان الجمع بين الصلاتين فی وقت واحد كبيرة من الكبائر

(موطا امام محمد ص ۱۳۲ حدیث ۲۰۵)

آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی مملکت کے اطراف میں یہ لکھ کر بھیجا کہ دو نمازوں کو جمع کرنے سے باز آئیں اس لئے کہ دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنا کبیرہ گناہ ہے۔

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہے کہ ہے امام ابوحنیفہ کے مسلک پر قرآن کریم کی آیت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ اور تابعین کے آثار موجود ہیں جس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ دو نمازوں کو ایک وقت پر ادا کرنا جائز نہیں ہے بلکہ ہر نماز

کو اپنے مقرر کردہ وقت پر ادا کرنا ہی ضروری ہے اور شریعت میں یہی مطلوب و مقصود ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں یہی پسندیدہ عمل ہے۔ ہاں دو مقام اس سے مستثنیٰ ہیں (۱) عرفہ (۲) مزدلفہ [illegible] وقت [illegible] نمازوں کو جمع کرنے کی اجازت ہے عرفہ کے مقام پر ظہر اور عصر اور مزدلفہ کے مقام پر مغرب اور عشاء اور یہ جمع بھی حقیقی نہیں بلکہ جمع صوری تھی جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آرہی ہے۔ ان دو مقام کے علاوہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنے کا اہتمام فرماتے تھے جیسا کہ حدیث نمبر۲ کے تحت حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت گزر چکی ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

یہ روایات اور ان جیسی دیگر روایات جن میں دو نمازوں کو ایک وقت میں جمع کرنے کا ذکر موجود ہے ان سے امام صاحب پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا ہے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک یہ جمع حقیقی نہیں بلکہ جمع صوری پر محمول ہے۔

جمع حقیقی سے مراد یہ ہے کہ ایک نماز کے وقت میں دوسری نماز بھی ساتھ ادا کر لی جائے بطور مثال کے ظہر کی نماز کے وقت میں عصر کی نماز یا عصر کی نماز کے وقت میں ظہر کی نماز بھی ساتھ ادا کی جائے۔

جمع صوری سے مراد یہ ہے کہ دیکھنے میں تو جمع ہو لیکن حقیقت کے اعتبار سے جمع نہیں بلکہ ہر نماز اپنے وقت پر ادا کی گئی ہو مثال کے طور پر ظہر کی نماز کو تاخیر کر کے اس کے بالکل آخری وقت میں پڑھی جائے اور عصر کی نماز کو اس کے اول وقت میں پڑھی جائے تو یہ دیکھنے کا اعتبار سے صورتاً تو جمع ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے ہر نماز اپنے وقت پر ادا کی گئی ہے اور یہ صورۃ امام صاحب کے نزدیک جائز ہے۔

چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں۔

وبهذا نأخذ والجمع بين الصلاتين ان تؤخر الاولى منها فتصلى فى أخر وقتها وتعجيل الثانيه فتصلى في اول وقتها. (موطا امام محمد ص۱۳۱ حدیث۲۰۴)

ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں دو نمازوں کو جمع کرنا اس طرح ہے کہ پہلی کو موخر کر کے آخری وقت میں پڑھے اور دوسری میں جلدی کر کے پہلے وقت میں پڑھ لے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مواقع میں جمع کے حقیقی نہیں بلکہ جمع صوری فرمایا ہے اس کے دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

دلیل نمبر ۱:

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

رایت النبی صلی الله علیه وسلم اذا اعجله السیر فی السفر یوخر الصلوۃ المغرب حتی مجمع بینها و بین العشاء

(بخاری جلد ا ص ۱۴۹ احدیث نمبر ۱۱۰۹)

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب آپ کو سفر جلدی کرنا ہوتا تو مغرب کی نماز کو موخر کر دیتے اور اسے عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھتے۔

دلیل نمبر ۲:

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی فرماتے ہیں

صلیت مع النبی صلی الله علیه وسلم ثمانیا جمیعاً و سبعا جمیعا قلت یا ابا الشعثاء اظنه اخر الظهر و عجل العصر واخر المغرب وعجل العشاء قال وانا اظن ذلك (مسلم جلد ا ص ۲۴۶ حدیث نمبر ۱۶۳۴)

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آٹھ رکعتیں (ظہر اور عصر) اکٹھی کر کے پڑھیں اور سات رکعتیں (مغرب اور عشاء اکٹھی کرنے پڑھی (راوی کہتے ہیں) اے ابو شعثاء میرا خیال ہے آپ نے ظہر کی نماز دیر کر کے اور عصر کی نماز جلدی پڑھی اور مغرب تاخیر کرکے اور عشاء جلدی کر کے پڑھی۔ انہوں نے فرمایا میرا بھی یہی خیال ہے۔

دلیل نمبر ۳:

حضرت نافع سے مروی ہے کہ

ان مؤذن ابن عمر قال: الصلاة قال سر سرحتى اذا كان قبل غيوب الشفق نزل فصلى المغرب ثم انتظر حتى غاب الشفق وصلى العشاء ثم قال ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان اذا عجل به امر صنع مثل الذی صنعت (ابوداؤد جلد۱ص۱۷۱، حدیث نمبر۱۲۱۲)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے موذن نے (ایک سفر کے موقع پر) کہا: نماز (پڑھ لی جائے) ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا چلتے رہو یہاں تک کے شفق غائب ہونے سے پہلے (سواری سے) اترے اور مغرب پڑھی پھر (کچھ دیر) انتظار کیا یہاں تک کہ شفق غروب ہو گیا تو عشاء کی نماز پڑھی، پھر فرمایا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کسی کام کی جلدی ہوتی تو آپ ایسا ہی کرتے جیسے میں نے کیا ہے۔

دلیل نمبر۴:

حضرت عثمانؓ سے مروی ہے کہ فرماتے ہیں:

وفدت انا وسعد بن مالك ونحن نبادر للحج فكنا نجمع بين الظهر والعصر نقدم من هذه ونؤخر من هذه ونجمع بين المغرب والعشاء نقدم من هذه ونؤخر من هذه حتى قدمنا مكة

(طحاوی جلد ص ۱۱۱ مکتبہ رحمانیہ حدیث نمبر ۹۵۹)

میں نے اور سعد بن مالک رضی اللہ عنہ نے اکٹھے سفر کیا ہم جلدی جا رہے تھے حج کے لیے ہم ظہر اور عصر کی نماز کو جمع کرتے ظہر کو مؤخر کرتے اور عصر کو مقدم کرتے تھے مغرب اور عشاء کو جمع کر کے مغرب کو مؤخر کرتے اور عشاء کو مقدم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم مکہ پہنچ گئے۔

دلیل نمبر۵:

حضرت عبدالرحمٰن بن یزید بھی فرماتے ہیں۔

صحبت عبدالله بن مسعود رضي الله عنه في حجة فكان يؤخر الظهر

ویعجل العصر ویوخر المغرب ویعجل العشاء ویسفر بصلاۃ الغداۃ.

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۱۱، حدیث نمبر ۹۹۰)

میں نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج کیا وہ ظہر (کی نماز) کو موخر فرماتے اور عصر کو جلدی پڑھتے مغرب کو موخر فرماتے اور عشاء جلدی پڑھتے اور فجر کی نماز اسفار میں پڑھتے۔

قارئین کرام! یہ روایات اس بات میں صریح ہے کہ جمع بین الصلاتین جمع صوری پر محمول ہے نہ کہ جمع حقیقی پر اور اس بات کی تائید رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے

جس کا خلاصہ اور مفہوم یہ ہے کہ ایک سفر کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی نماز فجر قضاء ہوگئی تو بعض صحابہ کرام نے آپس میں فرمایا۔

قد فرطنا فی صلاتنا فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ لا تفریط فی النوم انما التفریط فی الیقظہ (ابوداود جلد ۱ ص ۶۳، حدیث ۴۳۷)

ہم نے اپنی نمازوں میں تفریط (کوتاہی) کی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سو جانے کی حالت میں تفریط (کوتاہی) اور قصور) نہیں۔ کوتاہی تو جاگنے کی حالت میں ہے (یعنی نماز کو وقت پر ادانہ کرنا)

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد امام طحاویؒ فرماتے ہیں:

فاخبر صلی اللہ علیہ وسلم ان تأخیر الصلوۃ الی وقت التی بعدھا تفریط و قد کان قولہ ذلك وھو مسافر فدل ذلك انہ اراد بہ المسافر والمقیم فلما کان موخر الصلوۃ إلی وقت التی بعدھا مفرطاً فاستحال ان یکون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمع بین الصلوتین بما کان بہ مفرطا و لکنہ جمع بینھما بخلاف ذلك فصلی کل صلوۃ منھا فی وقتھا

(طحاوی جلد ۱ ص ۱۱۰، حدیث نمبر ۹۵۶)

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس روایت میں) اس بات کی خبر دی کہ نماز کو

دوسرے وقت تک موخر کرنا یہ تفریط ہے اور یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت سفر میں بیان فرمائی بس یہ روایت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس بات سے مسافر اور مقیم دونوں ہیں جب نماز کو دوسرے وقت مؤخر کرنے والا مفرط ہے تو یہ ناممکن ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نمازوں کو اس طرح جمع فرمایا ہو جس سے وہ مفرط بنے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جمع اس کے خلاف ہوگی (وہ اس طرح کہ) ہر نماز کو اپنے وقت پر ادا فرمایا ہے یعنی ایک نماز کو موخر فرما کر دوسری کو جلدی پڑھا۔

لہذا یہ ثابت ہوا کہ وہ تمام روایات جس میں نماز کو جمع کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد جمع حقیقی نہیں بلکہ جمع صوری ہے جیسا کہ تفصیلی گفتگو بحوالہ گزر چکی ہے۔

(۱۹) وقف شدہ چیز میں میراث کا جاری ہونا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے دو روایات نقل کی ہیں جن میں سے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ

اصاب عمر ارضا بخيبر فاتى النبى صلى الله عليه وسلم فسأله عنها فقال: اصبت ارضا بخيبر لم اصب مالا قط عندى انفس منه فما تأمرنا؟ فقال: ان ثئيت حسبت اِصلها و تصدقت بها، قال: فتصدق بها عمر انه لا يباع اصلها ولا يوهب ولا يورث فتصدق بها فى الفقراء والقربى وفى الرقاب وفى سبيل الله وابن السبيل والضيف، لا جناح على من وليها ان ياكل منها با المعروف او يطعم صديقا غير متمول فيه.

(ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خیبر میں ایک زمین ملی تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس زمین کے متعلق پوچھا اور کہا کہ مجھے خیبر میں ایسی زمین ملی ہے کہ اس سے بہتر مال مجھے کبھی نہیں ملا آپ مجھے کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تو چاہے اصل زمین کو روک لے اور اس کو (یعنی اس سے نفع کو صدقہ کر دے) راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو صدقہ کر دیا (اس شرط کے ساتھ)

کہ اصل زمین نہ بیچی جائے گی اور نہ کسی کو ہدیہ دی جائے گی اور نہ وراثت میں تقسیم ہوگی پس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس (کے نفع) کو فقراء، قرابت داروں غلاموں کے آزادی، فی سبیل اللہ، مسافروں اور مہمانوں کو صدقہ (وقف) کر دی نہیں ہے کوئی گناہ اس آدمی پر جو اس (وقف شدہ زمین) کا متولی ہو کہ وہ اس میں سے معروف کے مطابق خود کھائے یا اپنے دوست کو کھلائے اور اس کے ذریعے مالدار بننے والا نہ ہو۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد حافظ صاحب امام ابوحنیفہ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ان ابا حنیفة قال: یجوز للورثة ان یردوا ذلك (ایضاً)

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ورثاء کو وقف شدہ چیز لینے کی اجازت ہوگی۔

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ کسی چیز کو وقف کرنے کی دو صورتیں ہیں

(۱)......اصل چیز کو وقف کرنا، مثلاً کوئی جگہ مسجد، مدرسہ ہسپتال وغیرہ کے لیے وقف کر دے۔ اس صورت میں ایک دفعہ وقف کر دینے کے بعد یہ چیز وقف کرنے والے کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور وقت لازم ہو جاتا ہے اب یہ شخص اس وقف شدہ چیز کو نہیں لے سکتا۔

(۲)......اصل چیز کو وقف نہ کرنا بلکہ اس کے منافع کو وقف کرے۔ مثلاً کسی باغ کا پھل کسی چیز کا کرایہ کسی کام کے لئے وقف کر دے اور اصل چیز اپنے قبضہ میں ہی رکھے اس صورت میں آدمی کو یہ وقف واپس لینے کا اختیار ہے اور اگر یہ آدمی مر جائے تو اس کے ورثاء اس چیز کو واپس لے کر آپس میں تقسیم کر سکتے ہیں اس دوسری صورت میں وقف صرف اس صورت میں لازم ہوگا جب حکومت اسے لازم قرار دے یا وقف کرنے والا بطور وصیت یہ کہے کہ میرے مرنے کے بعد چیز وقف ہوگی یا وقت تو اپنی زندگی ہی میں کر دے لیکن اس وقف کو ہمیشہ کے لئے لازم قرار دے۔ امام ابوحنیفہ کی دلیل یہ ہے کہ وقف کی اس دوسری صورت میں جس میں اصل چیز کے بجائے اس سے حاصل ہونے والی آمدنی وقف کی جاتی ہے اصل چیز واقف کی ملکیت میں رہتی ہے اس لیے اس کے انتظام کا حق واقف کو ہوتا ہے اور اس کی آمدنی کو مختلف مدوں میں خرچ کرنے کی صوابدید اس کے پاس ہوتی ہے۔ اس

کے علاوہ کسی چیز سے متعلق جتنے مالکانہ حقوق ہو سکتے ہیں وہ اس شخص کو حاصل رہتے ہیں پس جب یہ چیز اس کی اپنی ملک میں ہے اس کی آمدنی کو وہ بطور صدقہ خرچ کر رہا ہے تو بالکل یہی بات ہے کہ اس کے وقف کو واپس لینے اور اسے بیچنے یا دیگر تصرفات کرنے کا حق بھی اس کو حاصل ہوگا۔ اسی طرح اگر واقف یعنی وقف کرنے والا مر جائے اور اس نے وقف شدہ چیز کو دائمی طور پر موقوف قرار نہ دیا ہو تو ظاہر ہے اس کی ملک میں ہونے کی وجہ سے یہ چیز اس کے ورثاء کا حق ہوگی اور انہیں اختیار ہوگا کہ وہ اسے وقف کی صورت سے نکال کر آپس میں تقسیم کر لیں۔

امام ابوحنیفہ کا یہ مذہب فقہی اور اصولی اعتبار سے درست ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

ان روایات سے امام ابوحنیفہ پر اعتراض وارد نہیں ہوتا بلکہ ان روایات سے امام ابوحنیفہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کیونکہ بخاری کی روایت میں اس طرح ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا

تصدق با صله لایباع ولا یوهب ولایورث ولکن ینفق ثمرة.

(بخاری جلد ۱ ص ۳۸۷، حدیث نمبر ۲۷۶۴)

اصل مال صدقہ کردو (اس طریقہ پر) کہ نہ بیچا جا سکے، نہ ہبہ کیا جا سکے نہ وراثت میں تقسیم کی جا سکے لیکن اس کا پھل خرچ کیا جائے۔

اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کرنے کی یہ صورت بیان فرمائی کہ تم اصل مال کو ہی صدقہ کردو کامل طور پر کہ نہ بیچی جا سکے نہ اس میں وراثت جاری ہو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی پر عمل فرمایا اور جیسا کہ ابن ابی شیبہ کی روایت میں بھی صراحت موجود ہے۔

فتصدقَ بها عمر انه لا یباع اصلها ولا یوهب ولا یورث

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زمین صدقہ کردی اس طریقہ پر کہ اصل زمین نہ بیچی جائے گی نہ ہبہ کی جائے گی اور نہ ہی وراثت میں تقسیم کی جائے گی۔

مصنف ابن ابی شیبہ کی اس روایت سے واضح طور پر امام ابوحنیفہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ واقف وقف شدہ چیز کے متعلق جب خود وضاحت وصراحت کردے یا حاکم وقت اسے ابدی قرار دے تو اس کو فروخت کرنا یا وراثت میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا لہٰذا امام ابوحنیفہ کا مذہب مذکورہ حدیث کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ واضح ہے۔

(۲۰) کافر کا بحالت کفر نذر ماننا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے دو روایات نقل کی ہیں۔ جن میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

نذرت نذراً فی الجاھلیة فسألت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد ما اسلمت فامرنی ان فی بنذری (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۴)

میں نے نہ جاہلیت میں ایک نذر مانی تھی تو میں نے اسلام لانے کے بعد (اس کے بارے میں) آپ صلی اللہ علیہم وسلم سے پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم فرمایا کہ میں اپنی نذر پوری کرو۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد ابن ابی شیبہ امام صاحب پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان ابا حنیفه قال: یسقط الیمین اذا اسلم (ایضاً)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جب اسلام لایا تو قسم ساقط ہوگئی۔ (یعنی نذر کو پورا کرنا ضروری نہیں)

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ جس آدمی نے حالت کفر میں کوئی نذر مانی

اس کا ایفاہ (پورا) کرنا واجب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ نذر وہ ہوتی ہے جو اللہ کی رضا کے لئے اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے مانی جائے اور اس میں غیر اللہ کی تعظیم مقصود نہ ہو اور کافر حالت کفر میں جو مانتا ہے اس میں محض اللہ کا تقرب مقصود نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اپنے باطل معبودوں کی رضا مقصود ہوتی، اس وجہ سے کافر کی یہ نذر غیر شرعی ہے اور جو نذر غیر شرعی ہو اور معصیت پر مبنی ہو تو اس کو پورا کرنا واجب (لازم) نہیں ہے۔ جیسا کہ احادیث میں موجود ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ۱:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

من نذر ان يطيع الله فليطعه ومن نذر ان يعصي الله فلا يعصه

(طحاوی جلد ۲ ص ۷۷، حدیث نمبر ۴۷۲۲)

جو اللہ کی اطاعت کی نذر مانے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اسے چاہیے کہ وہ اطاعت کرے اور جس نے معصیت کی نذر مانی وہ اسے نہ کرے۔

دلیل نمبر ۲:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يقول من نذر ان يعصي الله فلا يعصه. (طحاوی جلد ۲، ص ۷۷ حدیث نمبر ۴۷۲۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے جس نے اللہ کی معصیت کی نذر مانی ہو، تو وہ اللہ کی نافرمانی نہ کرے۔

دلیل نمبر ۳:

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

قال رسول الله صلی الله علیه وسلم انما النذر ما ابتغی به وجه الله.

(طحاوی جلد۲ص ۷۷، حدیث نمبر ۴۷۳۸)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ سلم نے فرمایا بے شک نذر وہی جائز ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو۔

ان روایات کے پیش نظر امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ حالت کفر میں لی گئی نذر کا پورا کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ حالت کفر کی نذر میں اصل غیر اللہ کی رضا مقصود ہوتی ہے جو کہ معصیت ہے اور معصیت کی نذر پورا کرنے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

ابن ابی شیبہ نے جو روایات نقل کی ہیں اس سے امام صاحب پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ نے نذر کو پورا کرنے کے واجب ہونے کا انکار کیا ہے کہ ہاں اگر کوئی استحباباً اسلام لانے کے بعد اپنی نذر کو پورا کرے تو امام صاحب کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہے۔

چنانچہ امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاوی الحنفی (المتوفٰی ۳۲۱ھ) اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں

فلما كانت النذور انما تجب اذا كانت مما يتقرب به الى الله تعالىٰ ولا تجب اذا كانت معاصی الله و كان الكافر اذا قال الله علی صيام او قال لله علی اعتكاف فهو لو فعل ذلك لم يكن به متقربا الى الله وهو فی وقت ما اوجبه انما قصد به الى ربه الذی يعبده من دون الله و ذلك معصيه فدخل ذلك فی قول رسول الله صلی الله عليه وسلم "لا نذر فی معصية" وقد يجوز ايضًا ان يكون قول رسول الله صلی الله عليه وسلم لعمر "فی بيدك" ليس من طريق ان ذلك كان واجبًا عليه ولكن انه قد كان سمح فی حال ما نذره ان يفعله فهو فی معصية الله عز وجل فامره النبی صلی الله عليه وسلم ان يفعله الأن علی انه طاعة الله عز وجل فكان ما امره به خلاف ماذا اذ كان

اوجبه هو علی نفسه وهذا قول ابی حنیفة وابی یوسف ومحمد رحمهم الله تعالیٰ (طحاوی جلد۲ ص ۷۷، مکتبه رحمانیه)

جب نذر ان چیزوں کی واجب ہے جن میں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے۔ اور جب وہ (نذر) اللہ تعالیٰ کی معصیت کے کاموں میں ہو تو واجب نہیں ہوتی اور اگر کافر نے جب یہ کہا کہ مجھ پر اللہ کے لئے روزہ ہے اور کہا میرے ذمہ اللہ کے واسطے اعتکاف ہے اگر وہ اس کو کرے بھی تو اس کو اس کے ذریعے تقرب الی اللہ مقصود نہیں اس نے جس وقت اس کو اپنے ذمہ واجب کیا تو (اس وقت) اس نے ان الفاظ کے ذریعے ان کی رضا کا ارادہ کیا جن کی وہ اللہ کے علاوہ عبادت کرتا ہے حالانکہ یہ (غیر اللہ کی عبادت) معصیت ہے بس یہ نذر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول "لا نذر فی معصیة" میں داخل ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے کہ تم اپنی نذر کو پورا کرو اس وجہ سے نہیں کہ وہ ان پر واجب تھی بلکہ انہوں نے جس وقت حالت کفر میں نذر مانی تھی اس وقت وہ نافرمانی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اب نذر پورا کرنے کا حکم دیا کیونکہ اب وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بات کا حکم دیا وہ خلاف ہے اس چیز کے جو انہوں (عمر رضی اللہ عنہ) نے اپنے اوپر واجب کیا تھا اور یہی حضرت امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کا قول ہے۔

امام طحاوی کی پوری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نذر پورا کرنے کا حکم اس لئے نہیں دیا تھا کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر واجب تھا کیونکہ حالت کفر میں کافر کی نذر معصیت پر مبنی ہوتی ہے اور اس کو پورا کرنے سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس سے منع فرمایا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم استحباباً تھا کہ اگر وہ پورا کرنا چاہے تو کرلے کیونکہ اب ان کا یہ عمل محض اللہ کی رضا کے لیے ہی ہوگا۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ کا مسئلہ امام ابن ابی شیبہ کی نقل کردہ روایات کے خلاف نہیں ہے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک بھی بطور استحباب کے ایسا کرنا جائز ہے انکار صرف ایفا نذر کے واجب ہونے کا ہے اور ان روایات سے ایفا نذر کا واجب ہونا ثابت نہیں ہوتا جب

کہ واجب نہ ہونے کی دلیل موجود ہے جیسا کہ آپ حضرات ملاحظہ کرآئے ہیں۔

(۲۱) بغیر ولی کے نکاح کرنا

اس مسئلہ کے تحت حافظ ابن ابی شیبہ نے تین روایات پیش کی ہیں۔ جن میں سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ايما امرأة لم ينكحها الولى او الولاة فنكاحها باطل قالها ثلاثا فان اصابها فلها مهرها بما اصابها فان تشاجروا فان السلطان ولى من لا ولى له. (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۴)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی عورت کا نکاح کوئی ولی نہ کروائے تو اس عورت کا نکاح باطل ہے یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمائی البتہ اگر خاوند نے نکاح کے بعد ہمبستری کر لی تو اسے مہر ملے گا پس اگر لوگ جھگڑا کریں تو جس کا ولی نہ ہو اس کا بادشاہ ولی ہوگا۔

اس کے بعد حافظ ابن ابی شیبہؒ امام ابوحنیفہ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ان ابا حنيفة كان يقول جائز اذا كان كفوءًا (ایضاً)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر شوہر کفو (ہم پلہ) ہو تو نہ نکاح جائز ہے۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ

اذا عقدت المرأة نكاحها بغير ولى، وكان كفوءجاز

(بدایۃ المجتہد جلد ۲ ص ۱۰ مکتبہ ابن تیمیہ قاہرہ)

جب عورت نے اپنا نکاح بغیر ولی کے کر لیا اور نکاح کفو (برابری) میں ہو تو جائز ہے۔

امام صاحب نے تمام احادیث و آثار کو سامنے رکھ کر یہ مسئلہ اختیار کیا ہے امام صاحبؒ نے بغیر ولی کے اجازت کے نکاح کو مطلق جائز قرار نہیں دیا بلکہ کفو (برابری) کی شرط بھی

لگائی ہے کہ اگر غیر کفو میں بغیر ولی کے نکاح کیا تو ولی کو اختیار حاصل ہوگا۔ وگرنہ نہیں۔ امام صاحب کا یہ مسئلہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

امام ابو حنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ۱:

قرآن کریم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (البقرہ:۲۳۴)

اور تم میں سے جو لوگ وفات پاجائیں اور بیویاں چھوڑ کر جائیں تو وہ بیویاں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن انتظار میں رکیں گی پھر جب وہ اپنی (عدت کی) میعاد کو پہنچ جائیں تو وہ اپنے بارے میں جو کاروائی (مثلاً دوسرا نکاح) قاعدے کے مطابق کریں تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس آیت کریمہ میں نکاح کرنے نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگر عدت کے بعد معروف طریقہ سے کسی مرد سے نکاح کر لیتی ہے تو وہ کر سکتی ہے کسی پر کوئی گناہ نہیں۔

دلیل نمبر ۲:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ:۲۳۲)

اور جب تم نے اپنی عورت کو طلاق دے دی ہو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو (اے میکے والو) انہیں اس بات سے منع نہ کرو کہ وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے (دوبارہ) نکاح کریں بشرطیکہ وہ بھلائی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ راضی ہوگئے ہوں۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بھی مطلقہ عورت کے (میکے والوں) یعنی اولیاء کو تنبیہ کی

ہے کہ مطلقہ عورتوں کومت روکو۔اس بات سے کہ وہ اپنے پسند کردہ شوہروں سے نکاح کریں خواہ پہلے ہی شوہر جنہوں نے طلاق دی تھی یا کسی دوسرے سے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اولیاء کو اجازت نہیں ہے کہ اگر کوئی مطلقہ عورت کفو میں اپنی مرضی سے نکاح کرنا چاہتی ہے تو انہیں روکے۔

اور غور طلب بات یہاں یہ ہے کہ اس آیت میں نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے جس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عورت اپنے نکاح خود کر سکتی ہے اولیاء کو روکنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔اس شرط کے ساتھ کہ دونوں کی رضامندی بھی ہو وہ شرعی اور معروف طریقہ سے قاعدے کے مطابق بھی ہو۔

دلیل نمبر۳:

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الايم احق بنفسها من وليها والبكر تستأذن في نفسها واذنها فماتها.

(موطا امام مالک ص ۴۹۸، حدیث نمبر ۹۸۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثیبہ کا اپنے اوپر ولی کی نسبت زیادہ حق ہے اور کنواری سے اس کے نکاح کے متعلق اجازت لی جائے اور اس کی خاموشی اس کی اجازت ہے۔

دلیل نمبر۴:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے

ان النبي صلى الله عليه وسلم قال لا تنكح الايم حتى تستامر ولا تنكح البكر حتى تستأذن قالوا يا رسول الله وكيف اذنها قال ان تسكت.

(بخاری جلد۲ ص ۱۷۷، حدیث نمبر ۵۱۳۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت کا نکاح اس وقت نہ کیا جائے جب تک اس سے اجازت نہ لے لی جائے اور (اسی طرح) باکرہ (کنواری) کا نکاح نہ کیا جائے یہاں

تک کہ اس سے اجازت لے لی جائے۔صحابہ کرام نے کہا اس کی اجازت کس طرح ہے اے اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کی اجازت یہ ہے وہ کن کو چپ ہو جائے۔

دلیل نمبر۵:

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال الثیب احق بنفسها من ولیها والبکر تستأمر ازنها سکوتها. (مسلم جلد ا ص ۴۵۵، حدیث نمبر ۳۴۷۷)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شادی شدہ عورت اپنے آپ کی اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے اور باکرہ عورت سے اجازت لی جائے گی اور اس کا خاموش رہنا اس کی اجازت ہے۔

دلیل نمبر۶:

حضرت عبداللہ ابن عبّاس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس الولی مع الثیب امر والیتیمة تستأمر وصمتها اقرارها. (ابوداؤد جلد ا ص ۲۸۶، حدیث نمبر ۲۱۰۰)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ولی کا ثیبہ (مطلقہ یا بیوہ) عورت پر کوئی اختیار نہیں اور یتیم لڑکی سے پوچھا جائے گا اور اس کی خاموشی (ہی) اس کا اقرار ہے۔

دلیل نمبر۷

حضرت خنساء انصاریہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ

ان اباها زوّجها وهی ثیب فکرهت ذلك فاتت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فرد نکاحه. (بخاری جلد۲ ص ۱۷۷، حدیث نمبر ۵۱۳۸)

ان کے والد نے ان کا نکاح کر دیا حالانکہ وہ ثیبہ تھیں۔انہیں یہ نکاح پسند نہ تھا اس لیے وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح فسخ کر دیا۔

دلیل نمبر ۸:

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے

جاء ت فتاة الى النبى صلى الله عليه وسلم فقالت: ان ابى زوجنى ابن اخيه ليرفع بى خسسته قال فجعل الامر اليها افقالت: قدا جزت ما صنع ابى ولكن اردت ان تعليم النساء ان ليس الى الاباء من الامر شىء

(ابن ماجہ ص ۱۳۵، حدیث نمبر ۱۸۷۴)

ایک نوجوان عورت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کیا میرے والد نے میرا نکاح اپنے بھتیجے سے کر دیا ہے تا کہ میری وجہ سے اس کی ذلت ختم کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اختیار دے دیا، تو اس عورت نے کہا میرے والد نے جو کیا وہ مجھے منظور ہے۔ لیکن میرا آپ صلی اللہ عیہ وسلم سے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ عورتوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ان کے باپوں کو ان پر (جبراً نکاح کرنے کا) کوئی اختیار نہیں۔

دلیل نمبر ۹:

حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

جـــاء ت امرأة الى النبى صلى الله عليه وسلم فقالت: يا رسول الله ان ولد عمى خطبنى فرده ابى و زوجنى وانا كادهة قال: فدعا اباها فسأله عن ذلك فقال: انى انكحتها ولم آلوها خيرًا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا نكاح لك اذهبى فانكحى من شئت.

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۳ ص ۲۷۵، حدیث نمبر ۱۶۲۰۱)

ایک عورت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرے چچا کے بیٹے نے مجھے نکاح کا پیغام بھیجا لیکن میرے والد نے اسے رد کر دیا اور میری شادی (وہاں) کر دی (جہاں) مجھے پسند نہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے والد کو بلایا اور اس سے اس کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا میں نے اس کا نکاح کروایا ہے اور اس کے لیے خیر کا ارادہ نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا تیرا نکاح نہیں ہوا جاؤ جس سے چاہو نکاح کرلو۔

دلیل نمبر ۱۰:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ

انها زوجت حفصه بنت عبد الرحمن المنذر بن زبير و عبدالرحمن غائب بالشام. (طحاوی جلد۲ ص ۸ حدیث نمبر ۴۱۷۱)

انہوں اپنی بھتیجی حفصہ بنت عبدالرحمٰن کا نکاح منذر بن زہیر سے کردیا حالانکہ عبدالرحمٰن (وہاں) موجود نہ تھے بلکہ وہ شام میں تھے۔

اس روایت کونقل کرنے کے بعد امام طحاوی فرماتے ہیں:

فلما كانت عائشه رضى الله عنها قدرأت ان تزويجها بنت عبد الرحمن بغيره جائز ورات ذلك العقد مستقيماً حتى اجازت فيه التمليك الذى لا يكون الا عن صحة النكاح و ثبوته استحال عندنا ان يكون ترى ذلك وقد علمت ان رسول صلى الله عليه وسلم قال لا نكاح الا بولى فثبت بذلك

(طحاوی جلد ا ص ۸)

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی غیر موجودگی میں اس کی بیٹی کے نکاح کرنے کو جائز سمجھا یہاں تک کہ اس عقد سے تملیک (بضعہ) کو جائز سمجھا جو ہمارے نزدیک نکاح کے صحیح اور ثابت ہونے کے بغیر نہیں ہوسکتی (یعنی یہ نکاح درست ہے) تو (یہ بات) محال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کو جانتے ہوئے کہ (لا نکاح الا بولی) ولی کے بغیر نکاح نہیں۔ اس (نکاح) کو جائز قرار دیا ہو۔

دلیل نمبر ۱۱:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

انه اجاز نكاح امرأة بغير ولى انكحتها امها برضاها.

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۳ ص ۲۷۵، حدیث نمبر ۱۶۲۰۰)

انہوں نے بغیر ولی کے نکاح کرنے کو جائز قرار دیا کہ اس کی ماں اس کا نکاح کی

اجازت سے کرواسکتی ہے۔

دلیل نمبر۱۲:

امام شعبی (المتوفی ۱۰۴ھ) فرماتے ہیں

اذا کان کفوا جاز

اگر کفو (برابر کا) ہو تو (بغیر ولی کے نکاح) جائز ہے۔

قارئین کرام! قرآن کریم کی آیات احادیث اور آثار سے یہ بات خوب واضح ہوگئی ہے کہ عورت اپنا نکاح خود کر سکتی ہے اور اس کو اختیار حاصل ہے کہ اگر بغیر ولی کے اس نے نکاح کر لیا تو وہ نافذ ہو جائے گا اگرچہ ولی کی اجازت اور اس کی رضامندی اور اس کی سرپرستی میں نکاح کرنا پسندیدہ عمل ہے۔ ان دلائل سے یہ بات بھی روز روشن کی طرح صاف اور واضح ہوگئی ہے کہ امام ابوحنیفہ کا مسلک قرآن وحدیث کے موافق ہی ہے۔

رہی وہ روایات جو ابن ابی شیبہ نے نقل کی ہیں تو اس کے جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

پہلی روایت کا جواب:

اس کے دو جواب ہیں:

(۱) یہ روایت منسوخ ہے کیونکہ اس کو روایت کرنے والی سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ جبکہ ان کا اپنا عمل اس روایت کے خلاف ہے جیسا کہ طحاوی کے حوالہ سے روایت گزر چکی ہے کہ انہوں سے اپنی بھتیجی کا نکاح اس کے ولی (باپ) کے بغیر کر دیا تھا۔ اور اصول حدیث میں سے یہ بھی ہے کہ اگر راوی نے روایت کی لیکن اس کا عمل اس روایت کے خلاف ہے تو اس روایت کا حکم یہ ہے کہ اس کی روایت غیر معمول بہا ہوگی۔ چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانی الحنفی (المتوفی ۱۲۹۷ھ) فرماتے ہیں:

عمل راوی بخلاف روایته بعد الروایة مما هو خلاف بیقین یسقط العمل به عندنا.

راوی کا عمل اپنی روایات کو بیان کرنے کے بعد یقینی طور پر اس روایت کے خلاف ہو تو راوی کا فعل ہمارے ہاں اس روایت کے لیے ساقط ہوگا۔

آگے مزید فرماتے ہیں:

عمل الصحابة او صحابی خلاف الحدیث یوجب الطن فیه اذا کان الحدیث ظاهراً لا یحتمل الخفاء علیهم او علیه.

(مقدمہ اعلاء السنن جلد ۱۹، ص ۲۰۲، مکتبہ دار القرآن والعلوم الاسلامیہ کراچی)

اگر صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کسی ایسی حدیث کے خلاف ہو جو ظاہر ہو اور اس میں کسی قسم کا خفا نہ ہو تو (صحابی کا عمل) اس روایت کے لیے خارج ہوگا۔

اس اصول کے پیش نظر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا اس روایت کے خلاف عمل کرنا اس کے نا قابل عمل ہونے کی دلیل ہے۔

دوسرا جواب:

اس روایت کا تعلق غیر کفو کے ساتھ ہے کہ اگر عورت نے غیر کفو میں نکاح کر لیا ہو تو اس حالت میں خاندان کی عزت کا مسئلہ ہوتا ہے اس لئے ولی کی اجازت ضروری ہے۔ ولی کی اجازت اور منظوری کے بغیر یہ نکاح باطل ہوگا۔

تیسرا جواب:

اس روایت میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی قانون بیان نہیں فرمایا کہ اگر ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیا تو وہ نکاح ہی باطل ہوگا۔ بلکہ اس کو روایت میں ولی کی اہمیت بتانا مقصود ہے کہ ولی کو نظر انداز کر کے خود نکاح کر لینا ناپسندیدہ عمل ہے اگر چہ نافذ ہو جائے گا اور عورتوں کو یہ بتلانا ہے کہ ان کا نکاح اگر چہ ان کی رضا مندی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کو ہر معاملہ ولی کے ذریعے ہی کرنا چاہیے اسی میں خیر و بھلائی اور بہت سی حکمتیں ہیں۔

ہم نے اس روایت کو ان صورتوں کے ساتھ خاص اس لیے کیا ہے تا کہ روایات میں

تعارض لازم نہ آتا ہے کیونکہ قرآن وسنت کے دیگر قطعی دلائل سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اگر عورت ولی کے بغیر نکاح کرے تو نکاح نافذ ہو جائے گا جیسا کہ آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔

لہٰذا ان صورتوں کی بنا پر تمام احادیث میں تعارض ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری اور تیسری روایت کا جواب:

امام صاحب کے نزدیک اس حدیث کا تعلق نابالغہ اور غیر عاقلہ سے ہے یعنی چھوٹی اور ناسمجھ لڑکی کا نکاح اس کے ولی کی اجازت کے بغیر نہیں ہو۔

(۲۲) میت کی طرف سے روزوں کی قضا کرنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے تین روایات نقل کی ہیں

پہلی روایت:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے

ان سعد بن عبادة رسول الله صلى الله عليه وسلم استفتى فى نذر كان على امه توفيت قبل ان تقضيه، قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: فاقضه عنها. (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۵)

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس نذر کے بارے میں سوال کیا جو ان کی والدہ پر تھی اور وہ اسے پورا کرنے سے پہلے ہی انتقال کر گئی تھیں، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم ان کی طرف سے یہ نذر پوری کر دو۔

دوسری روایت:

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں

كنت جالسا عن النبى صلى الله عليه وسلم، اذا جاء ته امرأة، فقالت: انه كان على امى صوم شهرين افاصوم عنها؟ قال صومى عنها. قال على

امك دين قضيته اكان يجزئى عنهاقالت بلى فصومى عنها۔

میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک عورت آئی اور اس نے کہا کہ میری والدہ پر دو ماہ کے روزے قضا تھے کیا میں ان کی طرف سے روزہ رکھ سکتی ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم ان کی طرف سے روزہ رکھو (مزید) فرمایا اگر تیری والدہ پر قرض ہوتا اور تم اس کو ادا کرتی تو کیا یہ کافی ہوتا تو اس عورت نے کہا کیوں نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تم ان کی طرف سے روزہ رکھو۔

تیسری روایت:

حضرت سنان بن عبداللہ جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہیں ان کی پھوپھی نے بیان کیا کہ

أنها أتت النبی صلی الله علیه وسلم، فقالت: یا رسول الله، إن أمی توفیت وعلیها مشی إلی الکعبة نذرًا، فقال النبی صلی الله علیه وسلم: أتستطیعین تمشین عنها؟ قالت: نعم، قال: فامشی عن أمك، قالت: أویجزء ذلك عنها؟ قال: نعم، قال: ارایت لو کان علیها دین قضیته، هل کان یقبل منك؟ قالت: نعم، فقال النبی صلی الله علیه وسلم: فدین الله أحق.

وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری والدہ اس حال میں فوت ہوگئی ہیں کہ ان پر مکہ کی طرف پیدل آنے کی نذر لازم تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم ان کی طرف سے (مکہ کی طرف) پیدل چل کر آسکتی ہو؟ انہوں نے کہا: جی ہاں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر ان کی طرف سے چل کر (مکہ) آؤ۔ سائلہ نے کہا کیا یہ ان کی طرف سے کفایت کر جائے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں (اور مزید) فرمایا اگر تمہاری والدہ پر قرض ہوتا اور تم اسے ادا کرتی تو کیا وہ قبول کر لیا جاتا؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ زیادہ حق دار ہے (کہ اس کا حق ادا کیا جائے)۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد حافظ صاحب امام ابو حنیفہ پر اعتراض کرتے ہیں فرماتے ہیں کہ

ان ابا حنیفه قال: **لا یجزئی ذلك** (ایضاً)

امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ یہ چیز (میت کو) کفایت نہیں کرے گی۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کے علاوہ امام شافعی، امام مالک اور جمہور اہل علم کا مذہب بھی یہی ہے کہ وہ عبادات جو محض بدنی ہے اس میں نیابت صحیح نہیں ہے جیسے نماز، روزہ، یہ محض بدنی عبادات ہے یہ عبادت اگر کسی دوسرے کی طرف سے کی تو ادا نہیں ہوتی۔

چنانچہ حضرت شیخ الہند الحنفی (المتوفی ۱۳۳۹ھ) فرماتے ہیں:

قال مالك و سفیان الثوری الشافعی لا یصوم احد عن احد وبه یقول الجماهیر من العلماء وابو حنیفة قالوا ان العبادات البدنیة لا تجوز فیها النیابة. (التقریر للترمذی لشیخ الهند ص۲۲)

امام مالک، سفیان ثوری اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ کوئی کسی (دوسرے) کی طرف سے روزہ نہ رکھے جمہور اہل علم اور امام ابوحنیفہ بھی اسی بات کے قائل ہیں اور یہ تمام حضرات فرماتے ہیں کہ عبادات بدنیہ میں نیابت جائز نہیں ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ امام ابوحنیفہ مطلق نیابت کو ناجائز نہیں کہتے ہیں بلکہ ان عبادت میں نیابت کو جائز نہیں سمجھتے۔ جس عبادت کا تعلق محض بدن سے ہو۔ ہاں اگر کسی عبادت کا تعلق محض بدنی نہیں بلکہ مالی بھی ہو جیسے حج کیونکہ یہ بدنی بھی ہے اور مالی بھی اس میں اگر اصل آدمی حج نہ کر سکے تو دوسرا اس کی طرف سے نائب بن کر حج کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ عبادات جن کا تعلق محض مال سے ہے جیسے صدقہ وزکوۃ وغیرہ تو ان میں مطلقاً نیابت جائز ہے۔

اس تفصیلی گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے نہ نماز پڑھ سکتا ہے اور نہ ہی روزہ رکھ سکتا ہے۔ ہاں روز کا فدیہ دوسرے آدمی کی طرف سے ادا کر سکتا ہے۔

امام صاحب کے اس موقف پر صریح دلائل موجود ہیں ملاحظہ فرمائیں:

امام ابو حنیفہؒ کے دلائل

دلیل نمبر ا:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے

عن النبی صلی الله علیه وسلم قال من مات وعلیه صیام شهر فلیطعم عنه مکان کل یوم مسکینا (ترمذی جلد ا ص ۱۵۲، حدیث نمبر ۷۱۸)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مر جائے اور اس کے ذمے ایک ماہ کے روزے فرض ہوں تو اس کی طرف سے ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلایا جائے۔

دلیل نمبر ۲:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے

لا یصلی احد من احد ولا یصوم احد عن احد ولکن یطعم عنه مکان کل یوم مد من حنطة.

(سنن الکبری للنسائی بحوالہ نصب الرایہ تخریج فرع احادیث ہدایہ جلد ۲ ص ۴۶۳)

کوئی آدمی کسی کی طرف سے نماز نہ پڑھے اور نہ کوئی کسی طرف سے روزہ رکھے مگر اس کی طرف سے مسکین کو کھانا کھلا دے۔

دلیل نمبر ۳:

امام بدرالدین عینی امام طحاوی کے حوالہ سے روایت نقل فرماتے ہیں کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ

ان امی توفیت وعلیها صیام رمضان ایصح ان اقضی عنها فقالت لا ولك تصدقی عنها مکان کل یوم علی مسکین خیر عن صیامك (وهذا سند صحیح) (عمدۃ القاری جلد ۱۱ ص ۸۵، مکتبہ دارالکتب العلمیہ)

میری والدہ وفات پا گئی ہیں اور ان کے ذمہ رمضان کے روزے باقی ہیں کیا درست ہے کہ میں ان کی طرف سے قضا کر لوں؟ تو آپ رضی اللہ عنہا نے فرمایا نہیں بلکہ اس کی طرف سے تم ہر روزے کے بدلے ایک مسکین پر صدقہ کرو۔

دلیل نمبر۴:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

كان يسئل هل يصوم احد عن احد او يصلي احد عن احد فيقول لا يصوم احد عن احد ولا يصلي احد عن احد.

(موطا امام مالک ص ۲۴۵، حدیث نمبر ۵۵۰)

ان سے سوال کیا گیا کہ کیا کوئی کسی طرف سے روزہ رکھ سکتا ہے یا کسی طرف سے نماز پڑھ سکتا ہے تو آپ نے فرمایا کوئی کسی کی طرف سے نہ روزہ رکھے گا اور نہ کسی کی طرف سے نماز پڑھے گا۔

دلیل نمبر۵:

حضرت نافع سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ

لا يصلين احد من احد ولا يصومن احد عن احد ولكن ان كنت فاعلاً تصدقت عنه او اهديت. (نصب الرایہ جلد۲ ص ۴۶۳)

کوئی آدمی کسی دوسرے کی طرف سے ہرگز نماز نہ پڑھے اور نہ دوسرے کی طرف سے روزہ رکھے، بلکہ اگر تم کرنا چاہتے ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کرو یا ہدیہ دو۔

دلیل نمبر۶:

امام مالک مدینہ کے تمام صحابہ کرام اور تابعین کا اس مسئلہ میں اجماع نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں

ولم اسمع عن احد من الصحابة ولا من التابعين رضي الله عنهم بالمدينة ان احداً منهم امر احد يصوم عن احد ولا يصلي عن احد وانما يفعله كل احد نفسه ولا يعمله احد عن احد (نصب الرایہ جلد۲ ص ۴۶۳)

میں نے مدینہ میں صحابہ کرام اور تابعین میں سے کسی کے بارے میں نہیں سنا کہ ان میں سے کسی نے دوسرے کی طرف سے روزہ رکھنے اور نماز ادا کرنے کا حکم دیا ہو بلکہ ان میں سے

ہر ایک اپنا عمل اپنے لئے ہی کرتا ہے اور کوئی بھی دوسرے کی طرف سے عمل نہیں کرتا۔

ان تمام صریح روایات سے معلوم ہوا کہ محض عبادات بدنیہ یعنی نماز اور روزہ میں نیابت درست نہیں ہے۔ جیسا کہ امام صاحب کا مذہب ہے۔

اور وہ روایات جو ابن ابی شیبہ نے نقل کی ہیں ان کے جوابات ملاحظہ فرمائیں۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

جواب نمبر ۱:

ان روایات کا مطلب یہ ہے نہیں کہ میت کی طرف سے نائب بن کر روزہ رکھا جائے یا نماز پڑھی جائے کیونکہ میت کی طرف سے نماز، روزہ اور عبادات بدنیہ میں نیابت جائز نہیں ہے جیسا دلائل آپ ملاحظہ کر چکے ہیں۔ بلکہ ان روایات کا مطلب یہ ہے کہ اپنی طرف سے روزہ رکھ کر یا نماز پڑھ کر ان کا ثواب میت کو پہنچا دے۔

جواب نمبر ۲:

یہ روایات منسوخ ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نیابتاً روزہ رکھنے کی روایت کے راوی عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں حالانکہ ان کا اپنا فتویٰ اس روایت کے خلاف ہے اور بخاری کی روایت میں نیابتاً روزہ رکھنے کی روایت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے اور ان کا اپنا عمل بھی اس روایت کے خلاف ہے جیسا کہ ہم ابو حنیفہ کے دلائل کے ضمن میں گزر چکا ہے۔ اور امام صاحب کے نزدیک صحابی کا فتویٰ یا عمل اس کی مروی روایت کے خلاف ہو تو اختیار اس کے فتوے اور عمل کا ہوگا کیونکہ صحابی کے شان کے لائق نہیں ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے خلاف فتوی دے یا عمل کرے لہٰذا صحابی کا اپنی مروی روایت کے خلاف فتویٰ دینا یا عمل کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ روایت منسوخ ہو چکی ہے وگرنہ صحابی رسول صلی اللہ وسلم کبھی بھی دانستا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی مخالفت نہیں کر سکتے۔

چنانچہ اسی اصول کو بیان کرتے ہیں علامہ بدر الدین عینی الحنفی فرماتے ہیں کہ

ان الصحابی اذا روی شیئا ثم افتی بخلافه فالعبرة لما رآه (الی ان قال) لانه لایلیق بجلالة قدر الصحابی ان مخالف مارواه من النبی صلی الله علیه وسلم لاجل اجتهاده فیه (الی ان قال) انما فتواه بخلاف ما رواه انما یکون لظہور نسخ (عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری جلد اص ۸۶ مکتبہ دارالکتب العلمیہ)

صحابی جب کوئی حدیث روایت کریں اور پھر فتوی اس روایت کے خلاف دیں تو اعتبار ان کے فتوی کا ہوگا (آگے فرماتے ہیں) اس لئے کہ صحابی کی عظمت اور شان کے لائق نہیں ہے کہ وہ اس حدیث کی مخالفت اپنے اجتہاد کی وجہ سے کریں جو انہوں نے (خود) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے (آگے مزید فرماتے ہیں) بیشک صحابی کا اپنی روایت کردہ حدیث کے خلاف فتوی دینا اس روایت کے نسخ کو ظاہر کرنے کے لئے ہے (یعنی وہ روایت منسوخ ہے)

قارئین کرام! ان عبارات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی ہے کہ ابن ابی شیبہ کی نقل کردہ روایت منسوخ ہے اور امام ابوحنیفہ کا مذہب احادیث کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ احادیث کے موافق ہے۔

(۲۳) زانی کو جلاوطن کرنا

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے دو روایات نقل کی ہیں۔

جن میں سے پہلی روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت شبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے

انهم كانو عند النبی صلی الله علیه وسلم فقام رجل فقال انشدك الله الا قضیت بیننا بكتاب الله فقال خصمه وكان افقه منه اقض بیننا بكتاب الله واذن لی حتی اقول قال قل، قال ان ابنی كان عسیفا علی هذا و انه زنی بامرأته فامدیت منه بمأة شاة خادم فسألت رجالا من اهل العلم فاخبرت ان علی ابنی جلد مأة و تغریب عام و ان علی امرأة هذا الرجم فقال النبی صلی الله علیه وسلم والذی نفسی بیده لاقضین بینكما بكتاب الله: المأة شاة

والخادم رد عليك وعلى ابنك جلد مأة و تعزيب عام (الی اخرہ)

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۵)

وہ لوگ رسول اکرم صلی اللہ مسلم کی خدمت میں موجود تھے ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں تو اس آدمی کے خصم نے کہا اور وہ اس سے زیادہ سمجھ دار تھا کہ آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں اور مجھے بات کرنے کی اجازت دیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہو اس آدمی نے کہا میرا ایک بیٹا اس کے ہاں ملازم تھا اور اس نے اس کی بیوی کے ساتھ زنا کیا تو میں نے اس کے فدیہ میں سو بکری اور ایک خادم دیا ہے پھر میں نے اہل علم حضرات سے (اس بارے میں) پوچھا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ میرے بیٹے پر سو کوڑوں کی سزا اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور اس کی بیوی پر رجم ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں ضرور تمہارے درمیان کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا کو بکریاں اور خادم تمہیں واپس ملیں گے اور تیرے بیٹے پر سو کوڑیں اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا ہے۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد ابن ابی شیبہ امام صاحب پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ان ابا حنیفة قال: لا ینفی (ایضاً)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ غیر شادی شدہ زانی کی اصل سزا سو کوڑے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں غیر شادی شدہ زانی کی اصل سزا سو کوڑے ہی مقرر کیے ہیں اس میں جلاوطنی کا کوئی ذکر نہیں ہے اور خبر واحد کے ذریعے قرآن کریم کے حکم میں زیادتی کرنا درست نہیں ہے لہٰذا جلاوطنی زنا کی حد میں داخل نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

غیر شادی شدہ زانی کی سزا کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور:۲)

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد سو مارو ہر ایک کو دونوں میں سے سو کوڑے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے غیر محصن یعنی غیر شادی شدہ زانی کی سزا مقرر فرمائی ہے جو کہ صرف سو کوڑے ہیں، اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ غیر شادی شدہ زانی کی سزا صرف سو کوڑے ہیں اس کے سوا کچھ نہیں۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

حافظ ابن ابی شیبہ نے جو روایات نقل کی ہیں وہ امام ابوحنیفہ کے خلاف نہیں کیونکہ امام صاحب کے نزدیک غیر محصن زانی کی سزا تو قرآن کریم کے مطابق سو کوڑے ہی ہیں لیکن اگر حاکم وقت اپنی صوابدید پر بطور تعزیر کے ملک بدر کرنا چاہے تو کر سکتا ہے لہٰذا امام صاحب کے نزدیک اس حدیث میں جلاوطنی کی سزا بطور حد کے ہے ہی نہیں بلکہ بطور تعزیر کے ہے اور امام صاحب بھی اس کے قائل ہیں کہ اگر حاکم وقت زانی کے اس علاقے میں رہنے سے خطرہ محسوس کرے یا اس کی اصلاح کے لیے اسے اس ماحول سے نکالنے میں مصلحت سمجھے تو وہاں سے نکال سکتا ہے۔

اور احادیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ جلاوطنی زنا کی حد نہیں ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زنا کے علاوہ بھی مختلف جرم میں جلاوطنی کی سزا دی ہے جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جلاوطنی کوئی شرعی حد نہیں بلکہ حاکم وقت کی صوابدید پر موقوف ہے چنانچہ عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

ان رجلاً قتل عبده متعمداً فجلده النبی صلی الله علیه وسلم مائة، ونفاه سنة و محا اراه سهمه من المسلمین وامره ان یعتق رقبة.

(طحاوی جلد۲ ص۹۷ حدیث نمبر ۴۷۴۳)

یک شخص نے اپنے غلام کو جان بوجھ کر قتل کر دیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سو کوڑے مارے اور ایک سال کے لئے جلا وطن کر دیا اور میرے خیال میں مسلمانوں سے اس کا حصہ مٹا دیا اور اس کو ایک غلام آزاد کرنے کا حکم دیا۔

حدیث نمبر۲:

سعید ابن مسیبؒ فرماتے ہیں:

غرب عمر ابن امیه بن خلف فی الشراب الی خیبر

(مصنف عبدالرزاق جلد ۷ ص ۴۶۴، حدیث نمبر ۱۸۱۱۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیہ بن خلف کے بیٹے کو شراب پینے کی وجہ سے خیبر کی طرف جلاوطن کو کیا۔

ان روایات سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ جلاوطنی یہ محض زنا کی حد نہیں بلکہ تعزیر ہے اور حاکم وقت کی صوابدید پر ہے کیونکہ مذکورہ احادیث میں زنا کے علاوہ بھی دیگر جرم کی وجہ سے جلاوطنی کی سزا دی گئی ہے۔ اور امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قتل اور شراب کی حد میں جلاوطنی شامل نہیں ہے لہٰذا معلوم ہوا کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زانی کو جلاوطنی کی سزا دینا بطور تعزیر کے تھا۔

اسی طرح وہ روایت جس میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قاتل کو ایک سال کے لیے جلاوطن کر دیا کے تحت امام طحاوی الحنفی فرماتے ہیں کہ

فلم یکن ما فعله رسول الله صلی الله علیه وسلم فی هذا من نفیه القاتل سنة دلیلا عندنا ولا عندك علی ان ذلك حد واجب لا ینبغی ترکه وانما کان علی انه للدعارة لا لانه حد فما تنکر ایضا ان یکون ماروی عن النبی صلی الله علیه وسلم مما امر به من نفی الزانی علی انه للدعارة لا لانه حد واجب کو جوب الجلد والرجم (طحاوی جلد ۲ ص ۷۹)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قاتل کو سال کے لئے جلاوطن کرنا ہمارے اور تمہارے

(دونوں کے) نزدیک اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ حد واجب ہے کہ اسے چھوڑا نہیں جا سکتا ہو وہ (جلاوطنی) صرف نافرمانی (گناہ) کی وجہ سے تھا حد ہونے کی وجہ سے نہیں تھا پس تم بھی انکار نہیں کر سکتے اس روایت کا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زانی کو جلاوطنی کا حکم فرمایا (یہ بھی) اس کی نافرمانی (گناہ) کی وجہ سے تھا نا کہ کوڑوں اور رجم کی طرح حد ہونے کی وجہ سے۔

قارئین کرام! امام طحاوی کی تمام عبارات کا خلاصہ ہے یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جلا وطنی کی سزا دینا حد میں شامل ہونے کی وجہ سے نہ تھا بلکہ تعزیراً تھا۔ بحیثیت حاکم ہونے کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلاوطنی کو مناسب سمجھا اس لیے جلاوطن کیا۔

لہٰذا ان تمام دلائل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امام ابو حنیفہ کا مسئلہ حدیث کے مخالف نہیں ہے۔

(۲۴) چھوٹے بچے کے پیشاب کا مسئلہ

اس مسئلہ میں حافظ ابن ابی شیبہ نے چار روایات نقل کی ہیں جن میں سے حضرت ام قیس رضی اللہ عنہا کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

دخلت بابن لی علی النبی صلی الله علیه وسلم لم یأکل الطعام فبال علیه فدعا بماء فرشه. (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۲۷۶)

میں اپنے بیٹے کو لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی جو کھانا نہیں کھاتا تو بچے نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیشاب کر دیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور پیشاب پر چھڑک دیا (یعنی دھویا نہیں)

اس کے بعد ابن ابی شیبہ امام صاحب پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ان ابا حنیفة قال: یغسل (ایضاً)

امام ابو حنیفہ فرماتے (بچے کے پیشاب کو) دھویا جائے گا۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ لڑکے کے پیشاب پر جب تک اس نے کھانا شروع نہ کیا ہو غسل خفیف ہوگا یعنی محض پانی چھڑکنا کافی نہ ہوگا، دھونا ضروری ہوگا ہاں بہت مبالغہ نہ کیا جائے گا جیسا کہ لڑکی کے پیشاب میں مبالغے کا حکم ہے۔

امام صاحب کا یہ مذہب احادیث کے موافق ہے ہم پہلے امام صاحب کے موقف کے دلائل نقل کرتے ہیں پھر ابن ابی شیبہ کی پیش کردہ روایات کا جواب عرض کریں گے۔

امام ابوحنیفہؒ کے دلائل

احادیث میں جیسے چھوٹے لڑکے کے پیشاب پر پانی چھڑکنے کا ذکر ہے وہیں چھوٹے لڑکے کے پیشاب پر پانی بہانے اور ڈالنے کا ذکر بھی موجود ہے۔ملاحظہ فرمائیں

دلیل نمبر۱:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بصبی فبال علی ثوبہ فدعا بماء فاتبعہ ایاہ. (بخاری جلد ۱ ص ۳۵ حدیث نمبر ۲۲۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بچہ لایا گیا اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے پر پیشاب کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور اس کپڑے پر خوب بہایا۔

دلیل نمبر۲:

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے

اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بصبی یرفع فبال فی حجرہ فدعا بماء فصبہ علیہ (مسلم جلد ۱ ص ۱۳۹ حدیث نمبر ۶۶۳)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شیر خوار بچہ لایا گیا اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پیشاب کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور اس پر بہایا۔

دلیل نمبر۳:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوتی بالصبیان فیدعو لهم فاتی بصبی مرة فبال علیه فقال صبوا علیها الماء صبا.

(طحاوی جلد ۱ ص ۶۹ حدیث نمبر ۵۷۵)

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دعا کے لیے بچوں کو لایا جاتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے دعا فرماتے ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بچہ لایا گیا اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پر اچھی طرح پانی بہادو۔

دلیل نمبر۴:

حضرت ابولیلیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلوسًا فجاء الحسین بن علی یحبو حتی جلس علی صدره فبال علیه قال فابتدرنا لنأخذه فبال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابنی ابنی ثم دعا بماء فصبه علیه

(مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱ ص ۱۴۵، حدیث نمبر ۱۲۹۹)

ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ حضرت حسین بن علی گھٹنو کے بل چلتے ہوئے آئے حتی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ پر بیٹھ گئے اور پیشاب کر دیا ہم جلدی سے آگے بڑھے تاکہ انہیں پکڑ لیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرا بچہ، میرا بچہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور اس کے اوپر ڈال دیا۔

دلیل نمبر۵:

حضرت حسن بصری اپنی والدہ خیرہ جو ام المؤمنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی باندی تھیں سے روایت کرتے ہیں۔

انها ابصرت ام سلمة تصب الماء علی بول الغلام مالم یطعم.

(ابوداؤد جلد ۱ ص ۵۴، حدیث نمبر ۳۷۹)

انہوں نے ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ وہ دودھ پیتے لڑکے کے پیشاب پر پانی بہا رہی تھیں۔

دلیل نمبر ۶:

ہارون بن تمیم فرماتے ہیں کہ

عن الحسن قال: الابوال کلها سواء. (ابوداؤد جلد ۱ ص ۵۴ حدیث نمبر ۳۷۶)

حسن بصری نے فرمایا (بچوں اور بچیوں کے) پیشاب سب برابر ہیں۔

ان احادیث کے پیش نظر امام ابوحنیفہ کا مسلک ہے کہ بچے کے پیشاب کو بھی دھویا جائے اس پر پانی بہایا جائے کیونکہ ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کے پیشاب پر پانی بہایا ہے محض رش اور نضح (چھڑکنے) پر اکتفا نہیں کیا گیا اسے ہی غسل خفیف کہتے ہیں۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

پہلی روایت کا جواب:

اس روایت کے الفاظ یہ ہیں ''دعا بماء فرشہ'' امام صاحب کے نزدیک یہاں پانی چھڑکنا مراد نہیں بلکہ پانی بہانا یا دھونا مراد ہے کیونکہ رش کا لفظ غسل بمعنی دھونا کے بھی استعمال ہوتا ہے اور احادیث میں اس کی نظیر موجود ہے۔

چنانچہ ترمذی میں حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ ایک خاتون نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کپڑے کے بارے میں پوچھا جس میں حیض کا خون لگ جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حتیه ثم اقرصیه بالماء ثم رشیه وصلی فیه

(ترمذی جلد ۱ ص ۳۶، حدیث نمبر ۱۳۸)

اسے کھرچ دو تم اسے پانی سے مل دو پھر اس پر پانی بہا دو اور اس (کپڑے) میں نماز پڑھو۔

اس حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''رش'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کا معنی یہاں بالاتفاق پانی بہانا، دھونا ہے نہ کہ محض پانی کا چھڑکنا مراد ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ابن ابی شیبہ کی نقل کردہ روایت کی کا معنی بھی یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور کپڑے پر بہا دیا یعنی غسل خفیف فرمایا اور یہی امام صاحب کا مسلک ہے۔

دوسری روایت کا جواب:

اس روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''انما ینضح من بول الذکر'' یہاں بھی نضح غسل (خفیف) کے معنی میں ہی ہے اور احادیث میں بھی نضح غسل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ سیدہ اسماء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ

جاء ت امراة الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقالت ارایت احدانا تحیض فی الثوب کیف تصنع قال تحتہ ثم تقرصہ بالماء و تنضحہ بالماء و تصلی فیہ. (بخاری جلد ۱ ص ۳۶، حدیث نمبر ۲۲۱)

ایک عورت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور عرض کی کہ یا رسول: آپ کیا فرماتے ہیں کہ ہم میں سے کسی عورت کو کپڑے میں حیض آ جائے (تو) وہ کیا کرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (کہ پہلے) اسے کھرچے پھر پانی سے رگڑے اور پانی سے دھوئے اور اس کپڑے میں نماز پڑھ لے۔

اس مقام پر شارحین نے ''تنضح'' کا معنی غسل (دھونا) ہی کیا ہے چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی الشافعی فرماتے ہیں:

النضح وھو صب الماء. (فتح الباری جلد ۱ ص ۳۲۷، مکتبہ السلفیہ)

نضح سے مراد پانی کا بہانا ہے۔

اسی طرح بخاری کے مشہور محشی مولانا احمد علی سہارنپوری الحنفی (المتوفی ۱۲۹۷ھ) فرماتے ہیں

و تنضحہ من باب فتح بفتح ای تغسلہ (حاشیہ بخاری جلد ۱ ص ۲۲۷)

تنضح باب فتح یفتح سے ہے جس کا معنی دھونا ہے۔

امام نووی الشافعی (المتوفی ٦٧٦ھ) شارح صحیح مسلم اس مقام پر فرماتے ہیں۔

معنى تنضحه تغسله وهو بكسر الضاء وكذا قاله الجوهرى وغيره و فى هذا الحديث وجوب غسل النجاسة با الماء

تنضح کا معنی دھونا ہے (تنضح) ضاد کے کسرہ کے ساتھ اور یہی بات امام جوہری وغیرہ نے کی ہے اور اس حدیث میں (اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ) نجاست کو پانی سے دھونا واجب ہے۔

اسی طرح حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

قال على بن ابى طالب ارسلنا المقداد بن الاسود الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فسأله عن المذى يخرج من الانسان كيف يفعل به فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم توضأ و انضح فرجك.

(مسلم جلد ا ص ۱۴۳، حدیث نمبر ٦٩٧)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم نے مقداد بن اسود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذی کے متعلق (حکم) پوچھے کہ انسان سے خارج ہو تو وہ کیا کرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وضو کر اور اپنی شرم گاہ کو دھولے۔

اس حدیث میں بھی ''انضح'' کا لفظ ہے جس کا معنی دھونا ہے چنانچہ امام نووی نضح کا معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

قوله صلى الله عليه وسلم وانضح فرجك فمعناه اغسله

(شرح مسلم للنووی جلد ا، ص ۱۴۳)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ''وانضح'' فرجک کا معنی ہے۔ اغسلہ ہے (یعنی وہ اپنی شرمگاہ کو دھولے)

ان روایت اور محدثین کرام کی عبارات سے یہ بات واضح ہوگئی۔ ہے کہ نضح کا معنی

(غسل) دھونے کے ہے اور یہی امام ابوحنیفہ کا موقف ہے۔

تیسری روایت کا جواب:

اس روایت کے الفاظ میں "**فبال علیه فاتبعه الماء ولم یغسله**" کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی بہایا دھویا نہیں ہے یہ روایت بھی امام صاحب کے مسلک کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس روایت میں نفی غسل (دھونے) کی نہیں ہے بلکہ تاکید اور مبالغہ کی نفی ہے جیسا کہ بچی کے پیشاب کو دھونے میں تاکید اور اور مبالغے کا حکم ہے۔

چنانچہ مسلم شریف میں روایت موجود ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

فدعا رسول الله صلی الله علیه وسلم بماء فنضحه علی ثوبه و لم یغسله غسلا. (مسلم جلد ا ص ۱۳۹، حدیث نمبر ۶۶۷)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور اپنے کپڑے پر بہا دیا اور اس کو اچھی طرح دھویا نہیں۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ نفی مطلقاً دھونے کی نہیں ہے بلکہ اس موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل خفیف فرمایا ہے اور یہی امام صاحب کا مسلک ہے۔

چوتھی روایت کا جواب:

یہ روایت امام صاحب کے بالکل مخالف نہیں۔ یہ روایت وہی ہے جو ہم نے امام صاحب کے دلائل کے ضمن میں حدیث نمبر ۴ کے تحت نقل ہے جو امام ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق ہے نہ کہ مخالف۔

قارئین کرام! ان تمام دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مسئلہ حدیث کے خلاف نہیں ہے۔

(۲۵) لعان سے ثابت ہونے والی حرمت کی حیثیت

اس مسئلہ میں ابن ابی شیبہ نے پانچ روایات نقل کی ہیں جن میں سے تیسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔

لا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم من رجل من انصار وامرأته ففرق بینهما. (مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۸ ص ۳۷۷)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کے ایک آدمی اور اس کی بیوی کے درمیاں لعان کروایا اور ان دونوں کے درمیان جدائی کردی۔

ان روایات کو نقل کرنے کے بعد ابن ابی شیبہ امام ابوحنیفہ پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

ان ابا حنیفة قال یتزوجها اذا کذب نفسه. (ایضاً)

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں جب شوہر اپنی تکذیب کردے تو وہ اپنی بیوی سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے۔

جواب:

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ کا مسلک اصول وقواعد کے مطابق ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ کا نظریہ یہ ہے کہ لعان کے بعد زوجین کا دوبارہ جمع ہونا اس وقت تک ناجائز وحرام ہے جب تک دونوں اپنے کیے لعان پر قائم اور برقرار ہوں۔ لیکن جب شوہر نے خود اپنے تکذیب کر دی اور اپنے الزام کو جھوٹا قرار دے دیا اور لعان سے رجوع کرلیا تو اب اس پر حد قذف جاری کیا جائے گا اور وہ عورت اس کے لیے حلال ہوگی کہ اس سے دوبارہ نکاح کرسکتا ہے کیونکہ حرمت کی جو وجہ تھی یعنی لعان جب وہ ختم ہوگئی ہے تو اب کوئی دوسری صورت موجود نہیں ہے کہ عورت مرد کے لئے ابدی طور پر حرام ہو اسی وجہ سے اس صورت میں کہ اگر مرد اپنی تکذیب کردے اور لعان سے رجوع کرلے تو وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح کرسکتا۔

چنانچہ علامہ ابن رشد المالکی (المتوفی ۵۹۵ھ) فرماتے ہیں کہ

وقال ابو حنیفة وجماعة اذا اکذب نفسه جلد الحد وکان خاطبا من الخطاب

کہ امام ابوحنیفہ اور ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جب شوہر، اپنے آپ کو جھوٹا قرار دے دے تو اس پر حد قذف جاری ہوگا اور دوسروں کی طرح وہ بھی (اس خاتون کو) نکاح کا پیغام

دے سکتا ہے۔

آگے علامہ ابن رشد امام ابوحنیفہ کی دلیل بیان کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں:

انه اكذب نفسه فقد بطل حكم اللعان فكما يلحق به الولد كذلك ترد المرأة عليه، وذلك ان السبب الموجب للتحريم انما هو الجهل بتعين صدق احدهما مع القطع بان احدهما كاذب فاذا انكشف ارتفع التحريم

(بدایۃ المجتہد جلد۳ ص ۲۲۵، مکتبہ ابن تیمیہ القاہرہ)

جب اس (شوہر) نے اپنے آپ کو جھوٹا قرار دے دیا تو لعان کا حکم باطل ہو گیا پس جیسے (لعان کے باطل ہونے سے) لڑکا اس کی ساتھ منسوب ہوگا اسی طرح عورت (بھی) اسے لوٹائی جائے گی کیونکہ حرمت کے واجب کرنے کا سبب یہ تھا کہ ان دونوں میں سے کسی کے سچے ہونے قطعی علم نہ تھا بس جب ایک کا جھوٹا ہونا ظاہر ہو گیا تو حرمت بھی رفع (ختم) ہو گئی۔

قارئین حضرات بدایۃ المجتہد کے حوالے بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ امام ابوحنیفہ کا مذہب اصولی طور پر درست ہے اور کسی حدیث کے مخالف نہیں ہے۔

حافظ ابن ابی شیبہؒ کی نقل کردہ روایات کا جواب:

اس مسئلہ میں ابن ابی شیبہ کی نقل کردہ تمام روایات اور ان کے علاوہ دارقطنی کی وہ روایت جس میں مذکور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دونوں لعان کرنے والے جب لعان کے بعد جدا ہو جائیں تو وہ دوبارہ کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

ان تمام روایات میں لعان کرنے والے کے درمیان ابدی حرمت کا حکم اس وقت تک ہے جب تک دونوں لعان کو برقرار رکھیں اور امام ابوحنیفہ بھی اس کے قائل ہیں ہاں اگر دونوں میں سے کسی ایک نے اپنے آپ کو جھوٹا قرار دے کر لعان کو ختم کر دیا تو ابدی حرمت کا حکم بھی ختم ہو جائے گا جس کی مکمل تفصیل گزر چکی ہے۔

لہٰذا امام ابوحنیفہ کو ان احادیث کا مخالف کہنا درست نہیں ہے۔